کتاب الایمان

ایمان کی حقیقت

(قرآن اور حدیث کی روشنی میں)

لیفٹیننٹ کمانڈر (ر) محسن اختر

ایم اے (فلسفہ)، ایل ایل بی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ!

کتاب: کتاب الایمان، ایمان کی حقیقت

مصنف: لیفٹیننٹ کمانڈر (ر) محسن اختر

ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی
(ادارہ معارف اسلامی، کراچی)
Email: irak.pk@gmail.com
Website: www.irak.pk

تقسیم کنندہ: اکیڈمی بک سینٹر (A.B.C.)
ڈی-۳۵، بلاک-۵، فیڈرل بی ایریا
کراچی-۷۵۹۵۰
فون: ۳۴۳۴۹۸۴۰-۳۶۸۰۹۲۰۱ (۰۲۱)

اشاعت: صفر المظفر ۱۴۳۶ھ - نومبر ۲۰۱۴ء

قیمت: ...... روپے

یقین محکم
عمل پیہم
محبت فاتح عالم

فرمان رب العالمین سبحانہٗ وتعالیٰ

"یہ دو لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ کہو (اے محمدؐ)! (درحقیقت) تم ایمان نہیں لائے۔ بلکہ تم یوں کہو کہ "ہم اسلام لائے (یعنی دینِ محمدؐ کی مخالفت چھوڑ کر مسلمان ہو گئے)، حالانکہ ایمان تو تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرنے لگو گے تو اللہ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے"۔
(الحجرات:۱۴)

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور عملِ صالح کرتے ہیں (پوری) نمازیں ادا کرتے ہیں، اور (مقررہ) زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ ان پر نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ ہی کوئی غم"۔ (البقرۃ:۲۷۷)

فہرست مضامین

الف۔	ابتدائیہ		۷
۱۔		ایمان	۹
	(i)	عقیدۂ ایمان کی تعریف	۹
	(ii)	عقیدۂ ایمان کی مختصر تاریخ	۱۲
	(iii)	ایمان کا (بیان قرآن وحدیث کی روشنی میں)	۱۷
۲۔		اللہ پر ایمان	۲۵
	(i)	تاریخ اولادِ آدم میں تصورِ خدا	۲۵
	(ii)	خدا کے وجود کے چند عقلی دلائل	۳۰
	(iii)	لفظ اللہ کے متعلق بیان	۳۳
	(iv)	اللہ تعالیٰ پر ایمان (قرآن کی روشنی میں)	۳۶
	(v)	اللہ تعالیٰ کی چند بنیادی خصوصیات	۴۰
	(vi)	اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفت	۴۳
	(ا)	توحید	۴۳
	(ب)	توحید الٰہی کی اقسام	۴۶
	۱۔	توحید الوہیت	۴۶
	۲۔	توحید خلاّقیت	۴۹
	۳۔	توحید ربوبیت	۵۹
	۴۔	توحید رحمانیت	۶۷
	(ج)	اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان	۷۴

۳۔		فرشتوں پر ایمان	۸۲
۴۔		الہامی کتب پر ایمان	۸۹
۵۔		قرآن پر ایمان	۹۳
۶۔		اللہ کے رسولوں پر ایمان	۹۸
۷۔		نبی کامل آخر الزماں عالی جناب محمدؐ پر ایمان	۱۰۳
۸۔		روز قیامت پر ایمان	۱۰۹
	(ا)	روز قیامت کی روداد	۱۱۸
	(ب)	قیامت کے بارے میں شک	۱۲۲
	(ج)	قیامت کا وقت	۱۲۷
	(د)	کتاب اعمال اور روز قیامت	۱۲۹
	(ہ)	روز قیامت اپنا اپنا بوجھ اٹھانا ہوگا	۱۳۱
	(و)	قیامت پر ایمان نہ لانے والوں کی دنیا میں سزا	۱۳۳
۹۔		تقدیر پر ایمان	۱۳۷
	(ا)	نظریہ جبریہ و قدریہ	۱۴۱
	(ب)	ہر شے القدر کے ساتھ پیدا کی گئی	۱۴۷
	(ج)	قدر پر ایمان کے مزید پہلو	۱۵۲
		۱۔ العلم	۱۵۲
		۲۔ الکتاب (لوح محفوظ)	۱۵۳
		۳۔ الخلق	۱۵۳
	(د)	تقدیر اور موت	۱۵۷
	(ہ)	نیک اور بد لوگوں کا مقدر	۱۵۸
	(و)	تقدیر اور دعا	۱۶۳
	(ز)	اقسام قدر و قضا	۱۶۵

	(ح)	قدر اور فطرت انسانی	۱۶۶
۱۰۔		مسلمان اور مومن	۱۷۰
۱۱۔		غرور اور تکبر ایمان کی نفی کرتے ہیں	۱۷۳
۱۲۔		ایمان بت پرستی کی نفی اور مذمت کرتا ہے	۱۷۵
۱۳۔		اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا ظلم عظیم ہے	۱۷۹
۱۴۔		مجرمین کا انجام	۱۸۲
۱۵۔		تجدید ایمان	۱۸۶
۱۶۔		بندے کا مالک سے عہد بندگی	۱۹۲

ابتدائیہ

بسم اللّٰہ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہ.

عام طور پر ایمان کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ کو الٰہ یعنی معبود مانا جائے اور رسول اللہ ﷺ جناب محمد کو اللہ کا آخری رسول مانا جائے، اور یہ کہ قیامت برپا ہوگی اور اس روز ہر بندے کا حساب کتاب ہوگا، جس کے مطابق اسے اس کی جزا و سزا دی جائے گی۔

ان عقائد کو دل سے تسلیم اور ذہن سے اقرار کرنا ہے تو ایمان، لیکن یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ ایمان کا کم ترین درجہ ہے۔ کیونکہ اس اقرار سے بندہ ایمان کے حلقے میں صرف داخل ہوتا ہے ایمان پاتا نہیں۔ کیونکہ اقرارِ ایمان کا مطلب ہے کہ بندہ اپنی سوچ، اپنے علم اور اپنے حکم کو اللہ تعالیٰ کے علم اور حکم کے تابع کر لے۔ جبکہ اس کام کے لیے قرآن اور اسوۂ حسنہ اور اقوالِ مبارکہ نبی کریم ﷺ کو دل میں بسا لینا اور اس پر نہایت سچائی کے ساتھ عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ تا کہ اس کا ایمان کامل ہو جائے اور وہ مومن بن کر مومنین کے حلقے میں داخل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور قربت اختیار کر سکے۔

اس لیے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جو اقرار ایمان تو کرتے ہیں، لیکن کم ناپنے اور کم تولنے میں شرمندگی محسوس نہیں کرتے، جھوٹ بولنے پر فخر محسوس کرتے ہیں، دھوکا دہی میں ماہر، رشوت ستانی کے عادی اور عیش و عشرت کے رسیا، اپنے مطلب کی خاطر عزت فروشی کو جائز سمجھتے ہیں اور مفاد اور ہوس کو پورا کرنے کے لیے کسی کو قتل کرنا معیوب نہیں سمجھتے اور لوگوں کا مال جبر اور دھوکے سے ہڑپ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ بے علم ہونے کے باوجود علم والوں کی توہین کرتے ہیں، انھیں اپنا بے راہ روی والا علم سکھانے کی مذموم کوششیں بھی کرتے ہیں۔ قانون کے علم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، لیکن قانون سازی کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں۔ قومی دولت لوٹ کر قوم کے خادم کہلاتے ہیں،

انصاف گھر کے محافظ عوام الناس کو انصاف کے لیے تڑپاتے ہیں۔ لوگوں کی حفاظت کرنے والے خود ان کے لوٹنے کا اہتمام کرتے ہیں، بیشتر استاد اور عالم علم فروش بن چکے ہیں۔ لیکن ایسے تمام کے تمام لوگ مسلمان تو کہلاتے ہیں لیکن ایمان ہنوز ان کے دل تک نہیں پہنچا ہوتا۔ افسوس! صد افسوس... ! مسلمان بننا نہایت دشوار ہے، اسی لیے علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ مسلمان بننے کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو زندگی میں اپنانا بذریعہ قرآن حکیم اور جناب رسول کریم ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور اقوالِ مبارکہ کو اپنانے کے بعد انسان ایمانِ کامل پر کاربند ہو سکتا ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں ایک عاجزانہ کاوش کی گئی ہے کہ عقیدۂ ایمان کو اختصار کے ساتھ قلمبند کیا جائے، ایک عام فہم زبان میں، تا کہ عوام الناس بالخصوص دین کے طالب علم اس سے استفادہ حاصل کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائیں، آمین۔

والسلام
احقر العباد، محسن اختر
۱۳۰ کتوبر ۲۰۱۲ء
لبک، ٹیکساس، امریکا

۱۔ایمان

(1) عقیدۂ ایمان کی تعریف

ایمان کا مطلب ہے کسی حقیقت یا اس کے متعلق اس کے ہونے پر یقین کر لیا جائے اور اسے بغیر کسی شک و شبہ تسلیم کر لیا جائے اور اس بات کی گواہی بھی دی جائے۔یعنی اس بات کی تصدیق بھی کی جائے۔اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ کسی بات کو بغیر کسی دلیل کے مان لینا اس بات کے سچ ہونے کا یقین کر لینا ہے۔

اس بات کی مثال دینے کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا مناسب ہوگا، وہ یہ کہ ایک جنگ کے موقع پر ایک عام سا مسلمان جس کے ہاتھ میں کھجوریں تھیں اور وہ انہیں کھا رہا تھا، وہ جناب رسول کریم ﷺ کے سامنے آیا اور پوچھا یا رسول اللہؐ، اگر میں اس لڑائی میں شریک ہو جاؤں اور مارا جاؤں تو اس کے عوض مجھے کیا ملے گا۔آپ ﷺ نے فرمایا: جنت۔آپؐ کا یہ فرمانا ہی تھا کہ اس اعرابی نے اپنے ہاتھ کی کھجوریں پھینک دیں اور جنگ میں شریک ہو گیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد رتبۂ شہادت پر فائز ہو گیا۔تو یہ ہے ایمان کا اعلیٰ درجہ کہ وہ خوش نصیب بغیر کسی دلیل کے اور بغیر کسی ہاؤ کے فوراً جناب رسول کریم ﷺ کی سچائی پر یقین لے آیا۔اور پھر اس یقین پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔

اسی بات کو فلسفیانہ انداز میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایمان کا مطلب یہ ہے کہ چند مابعد الطبیعاتی حقیقتوں (Metaphysical Aspects) پر اس طرح یقین کر لیا جائے جیسے یقین کرنے والی آنکھ نے نہ تو دیکھا ہو، نہ اس کے کانوں نے اس کے متعلق کوئی بات سنی ہو اور نہ ہی وہ شخص اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے کسی دلیل کا طلبگار رہے۔ بلکہ وہ فوری طور پر اپنے دل و دماغ کو اس بات پر آمادہ کر کے مطمئن ہو جائے کہ بیان کرنے والے نے ایک سچی اور حقیقت پر مبنی بات کہی ہے۔پھر وہ اس بات پر یقین کے اس درجے تک پہنچ

جائے کہ خود اس بات کی گواہی اس طرح سے دے کہ جیسا کہ وہ خود اس بات کا شاہد ہو۔

اس بات کی مثال دینے کے لیے ایک واقعہ ہمارے سامنے آ گیا، وہ یہ کہ جب نبی کریم ﷺ نے واقعۂ معراج کے فوراً بعد اس کا ذکر اہل قریش سے کیا تو انہیں آپ کی یہ بات انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہوئی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ رات بھر میں فلسطین جانا اور فوری طور پر واپس بھی آ جانا ؟ان لوگوں کا اس واقعہ پر یقین لانا تو ممکن نہ تھا لیکن چند نو مسلم بھی اس واقعہ کو سن کر اپنا ایمان کھو بیٹھے۔اسی دوران ان مشرکین مکہ کی ملاقات جناب ابوبکرؓ سے ہوئی اور انہوں نے جناب ابوبکرؓ سے طنزیہ طور پر کہا کہ کیا تم نے سنا ہے کہ تمہارے دوست نے کیا کہا، پھر جناب ابوبکرؓ کے پوچھنے پر انہوں نے اس واقعہ کے دعویٰ کا ذکر کیا۔ جناب ابوبکرؓ کا حال اس واقعہ سے بے خبر تھے۔چنانچہ انہوں نے نہایت بے قراری کے عالم میں پوچھا کہ کیا واقعی جناب رسالتمآب نے یہ فرمایا ہے؟ پھر قریش سے اس بات کی تصدیق سنی اور فرمایا کہ ''جب میرے رسول ﷺ نے فرمایا تو پھر اس میں شک کی گنجائش کیسی؟ آپ ﷺ نے بالکل صحیح فرمایا، آپؐ ضرور گئے ہوں گے۔اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ یہ سچا واقعہ ہے۔

جب اس واقعہ کا ذکر عالیجناب رسالتمآب ﷺ کو ہوا تو آپؐ نے خوش ہو کر جناب ابوبکرؓ کو ''صدیق'' کے خطاب سے نوازا۔

ایمان چونکہ مابعد الطبیعاتی حقیقتوں کو تسلیم کر کے ان پر یقین کرنے کو کہتے ہیں، اس لیے ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہمارے خالق و مالک نے ہمارے لیے کن کن حقیقتوں پر یقین کر لینے کو فرمایا ہے۔ پس وہی حقیقتیں ایمان کے بنیادی ارکان ہیں جو درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

(۱) اللہ پر ایمان (۲) فرشتوں پر ایمان (۳) رسولوں پر ایمان (۴) الہامی کتابوں پر ایمان (۵) روز قیامت پر ایمان اور (۶) تقدیر پر ایمان۔

ایمان لانا تو کچھ نیا رہ مشکل نہیں لیکن پھر ایمان لانے کے بعد اس پر یقین محکم اور عمل پیہم کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایمان کے بنیادی حقائق کو سمجھ لیا جائے، تاکہ ان پر یقین کامل بھی کیا جا سکے اور پھر اس یقین کا عملی مظاہرہ بھی کیا جائے۔

چونکہ ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس سے ہے اور پھر ان احکامات کے مطابق جو

جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعے سے اولادِ آدم تک پہنچائے، لہٰذا ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ایمان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی الہامی کتاب آخر میں کیا فرمایا، اور پھر ان احکامات پر اللہ کے نبی کامل و آخر الزماں ﷺ نے کس طرح سے عمل فرما کر امت کو راہبری عطا فرمائی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جناب رسول کریم ﷺ کا ایک فرمان مبارک ہے، جسے جناب ابو ہریرہؓ نے روایت کیا ہے کہ:

ایک روز جناب نبی کریم ﷺ چند اصحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ جناب جبرائیلؑ آئے اور پوچھا کہ "ایمان کیا ہے؟"۔

اللہ کے نبیؐ نے جواب دیا کہ "ایمان ہے اللہ کو ماننا، اس کے فرشتوں کو، اس کے رسولوں کو اور روزِ قیامت کو ماننا" (ایک دوسری حدیث میں ان چار کے علاوہ اللہ کی کتابوں اور تقدیر کا بھی ذکر کیا ہے)۔

پھر جبرائیلؑ نے پوچھا: "اسلام کیا ہے؟"

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "صرف اللہ واحد کی عبادت کرنا، اور کسی کی بھی نہیں، صلوٰۃ قائم رکھنا (مقررہ پانچ اوقات پر)، زکوٰۃ ادا کرنا (سالانہ) اور ماہِ رمضان کے روزے رکھنا۔ (ایک اور حدیث کے مطابق ان چار کے علاوہ حج کرنا بھی ہے)۔

پھر پوچھا جبرائیلؑ نے: "احسان کیا ہے؟" (یعنی ایمان کی صحیح حالت Perfection)

آپؐ نے جواب دیا: "اللہ کی عبادت اس طرح سے کرنا جیسے تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تمہاری عبادت کمال کا یہ درجہ نہ پا سکے تو تمہیں اس منزل تک پہنچنا چاہیے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے"۔

پھر جبرائیلؑ نے سوال کیا: "کب آئے گا وہ وقت (یعنی روزِ قیامت)"۔

آپؐ نے جواب دیا کہ: "جواب دینے والے کو اس سے زیادہ علم نہیں جتنا کہ سوال کرنے والے کو ہے۔ لیکن میں اس کی نشانیاں بتا سکتا ہوں" اور وہ یہ ہیں کہ:

۱) جب ایک غلام عورت اپنے آقا کو جنم دے گی۔

۲) جب کالے اونٹوں کے چرواہے فخر کرنا شروع کر دیں گے، اور مقابلہ کریں گے دوسروں سے اونچی اونچی عمارتیں تعمیر کرنے میں۔

۳) اور قیامت کے دن (جو ان پانچ میں سے ہے جس) کو اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا۔

پھر اس کے بعد جناب نبی کریمؐ نے سورہ لقمان کی آیت ۳۴ تلاوت فرمائی۔

ترجمہ: "بے شک یہ صرف اللہ کے علم میں ہی ہے قیامت کا وقت، وہی بارش نازل فرماتا ہے اور جو ہے ماؤں کے ارحام میں، اسے جانتا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ کل (وہ) کیا (کچھ) کرے گا۔ نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ (وہ) کس زمین پر فوت ہوگا۔ (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ ہی پورے علم والا اور صحیح جاننے والا ہے"۔

بخاری میں روایت ہے کہ پانچ چیزیں "مفاتیح الغیب" ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جو درج ذیل ہیں۔

۱) قیامت کی علامات کا علم ہے، وقت کا نہیں۔ یہ علم صرف اللہ کے پاس ہے۔

۲) بارش کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، حالانکہ فی زمانہ اس کے بارے میں تخمینے لگانے کا علم تو ہے، لیکن اس کی ضمانت نہیں کہ وہ سو فیصد درست ہوں۔

۳) فی زمانہ رحمِ مادر میں بچے کی جنس کا پتا تو لگا لیا جاتا ہے، لیکن اس کے مقدر اور دیگر معاملات کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں ہوتا۔

۴) آنے والے کل کی کسی کو خبر نہیں ہوتی، سوائے اللہ کے۔

۵) موت کب، کہاں اور کیسے آئے گی کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے۔

پھر اس کے بعد وہ شخص چلا گیا۔ تب جناب نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ اُسے بلاؤ، لیکن وہ اسے دیکھ نہ سکے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جبرائیلؑ تھے اور لوگوں کو دین سکھانے آئے تھے۔

۱(11)۔ عقیدۂ ایمان کی مختصر تاریخ

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ ہر دور اور ہر قوم میں انسان یہ عقیدہ رکھتا تھا اور آج بھی رکھتا ہے کہ اسے کسی ہستی نے پیدا کیا اور وہی موت بھی دیتا ہے۔ اور جو اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور اس کا کاروبارِ ہستی چلاتا ہے وہی غم اور خوشیاں بکھیرتا ہے اور جو غم اور خوشیاں بکھیرتا ہے اور عالم بے بسی اور بے کسی میں ان کی فریاد سنتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے۔ یہ خیال اور

عقیدہ بھی رہا اور ہے کہ کوئی ایسی ہستی ہے جو ان گنت مخلوق کو رزق بہم پہنچاتی ہے اور بیماروں کو شفا عطا کرتی ہے۔

یہ سوالات کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ چنانچہ انسان نے کسی ایسی ہستی کو اپنے تخیل میں لانے کی کوشش کی۔ اس ہستی پر یقین بھی کیا اور پھر اس ہستی کی قربت اختیار کرنے کی کوشش اور خواہش بھی کی۔ اور پھر اس کی بندگی اختیار کر کے اُسے راضی کرنے کی کوشش بھی کی۔

تاریخ سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ بڑے بڑے دانشور اور فلسفی بھی اس حقیقت کی کھوج میں لگے رہے، تاکہ جان سکیں کہ وہ کیسی ہستی ہے۔ انہوں نے یہ راز جاننے کے لیے اپنی عقل کو ہر زاویے پر رکھ کر پرکھا۔ لیکن یہ معاملہ ان کی سمجھ میں نہ آیا اور وہ کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ کسی نے کہا کہ وہ ہستی خدا ہے، کسی نے اور نام دیا اور کسی نے اس کی نفی کی۔ بہت سے فلسفی لوگوں کو قائل کرتے رہے کہ خدا ہے اور وہ اس کے لیے مختلف دلائل دیتے رہے اور کئی اس عقیدے کے خلاف دلائل دیتے رہے کہ خدا نام کی کوئی ہستی نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ خدا کی ہستی کو تسلیم کرنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ میں جان لوں کہ میرا وجود ہے اور جب میرا وجود ہے تو اس کا پیدا کرنے والا بھی کوئی ہے۔ یہ فرانسیسی فلسفی تھا Rene Descartes، اس نے آخر کار یہ فیصلہ سنا دیا کہ چونکہ میں ہوں، اس لیے خدا بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور محسن فلسفی Kant نے کہا کہ دلیل کے ذریعے ہم خدا کو نہیں جان اور مان سکتے، کیونکہ دلیل کے ذریعے سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ خدا نہیں ہے اور پھر دلیل ہی کے ذریعہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا ہے۔ لیکن، اس نے کہا کہ انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کے تصور کو اپنے ذہن میں لا کر قبول کریں، کیونکہ خدا کی حاکمیت کو مان لینے میں ہی ہماری بھلائی نظر آتی ہے۔ اس نے کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ اپنی زندگی میں اخلاقی اقدار کی پاسداری کر کے جانوروں سے بلند ہو جائیں تو پھر ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کے وجود کو تسلیم کر لیں، تاکہ ہمارا معاشرہ برائیوں سے بچ سکے۔ بصورت دیگر ہم کبھی بھی اچھی زندگی نہیں گزار سکتے۔

ایسے تمام کے تمام فلسفی قابل رحم معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ وہ دانشمند ہونے کے باوجود

بصیرت سے محروم نظر آتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے اپنی عقل کے دائرے میں محدود ہو کر خدا کی تلاش کی۔ حالانکہ ان کی عقل کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو عقل و دانش سے سرفراز فرمایا، لیکن ان کی عقل کے درجات مقرر فرما دیے۔ مثلاً چیونٹی اور شہد کی مکھی اور ان جیسی ہی دیگر مخلوقات میں اللہ تعالیٰ نے اچھی خاصی عقل دی۔ ان دنوں میں جو عقل کی حد ہے وہ حیران کن بھی ہے اور قابلِ تجسس بھی۔ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کے بیان کے لیے اسی کے نام سے سورہ النحل نازل فرمائی اور اس کی آیات ۶۸ اور ۶۹ میں اس کے بارے میں بیان فرمایا، جس سے اس کی عقل کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح سے چیونٹی کے بارے میں سورہ النمل آتا ری، اور اس کی آیات ۱۸ اور ۱۹ میں چیونٹی کی دانش کے بارے میں بیان فرمایا۔

اس بیان سے یہ بتانا مقصود تھا کہ جس درجہ پر چیونٹی اور شہد کی مکھی اور ان جیسی دیگر مخلوقات کی عقل ختم ہوتی ہے، وہاں سے ان سے اعلیٰ مخلوق کی عقل شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح سے درجہ بدرجہ حیوانات اور نباتات میں عقل کے اعتبار سے مخصوص درجہ بندی کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ حتیٰ کہ مخلوقات سے سب سے زیادہ عقل کا درجہ رکھنے والی مخلوق اللہ تعالیٰ نے انسان بنائی ہے اور انسان کی عقل کو بھی ایک مقررہ درجے تک فائز رکھا ہے۔ لیکن اس کی عقل کے دائرے میں مابعد الطبیعاتی مخلوقات نہیں آتیں۔ لیکن ان کا سمجھنا بھی انسان کے لیے ضروری رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ انسان اس زمین اور اس کائنات کے روز و شب کو سمجھے، جنت اور دوزخ کو جانے، روح کے متعلق کچھ سمجھے، اپنے خالقِ حقیقی کو جانے اور اس کی معرفت حاصل کرے۔ فرشتوں کی اور آسمانوں کی حقیقت کو سمجھے۔ لیکن یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے اس کی عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ یہ تمام چیزیں انسانی عقل سے ماورا ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی طرف سے ایک علمِ خاص بخشا اور وہ علم اپنے مخصوص لوگوں پر الہام کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ اس علم کو تمام لوگوں تک پہنچا دیں۔

اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص علمِ ہدایت ملنے کے بعد جس جس نفس نے اس سے استفادہ حاصل کیا، اس نے تو انسانی معراج تک رسائی پائی۔ لیکن وہ بہت سے بدقسمت

لوگ جنہوں نے اس علم سے لاپرواہی برتی یا منہ موڑا تو وہ بے شک گمراہی کی راہ میں پڑ گئے اور انہوں نے کبھی بھی اخلاقیات کے معیار تک رسائی حاصل نہ کی۔ بلکہ وہ اس کے برعکس معاشرے کی قبیح برائیوں میں مبتلا ہو گئے اور اپنے خالق کے بارے میں بھی غلط اور بے بنیاد عقیدوں اور تصورات میں گم ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے جو علم الہام فرمایا، وہ یقیناً معاشرے میں ایک خوشگوار اور اخلاقیات پر مبنی تبدیلی کا ضامن تھا اور آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس لیے انسان کو اپنی ذاتی اور معاشرتی زندگی امن چین، قرینے اور قاعدے سے گزارنے کے لیے تمام علوم کا احاطہ کرنا چاہیے، تاکہ وہ معاشرے کا ایک کارآمد حصہ بن کر اس کی تعمیر میں مثبت کردار ادا کر سکیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے خاص علم کے ذریعے سے بتا دیا کہ اس کائنات کا خالق کون ہے، مالک کون ہے، جس نے اس ارض و سماء اور دیگر تمام مخلوق کو پیدا فرمایا اور انسان کو اس کی وجہ تخلیق سے بھی آگاہی بخشی اور انسان کو زندگی گزارنے کا سلیقہ اور قوانین عطا فرمائے۔ اور اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے ہر قوم و ملت کو زندگی کے اعلیٰ معیار کے مطابق بسر کرنے کی عملی تربیت فراہم کی۔ پس اس بات کو تسلیم کر لینے سے عقیدۂ ایمان کی ابتدا ہوتی ہے۔

مختلف ادوار میں اللہ تعالیٰ نے مختلف اقوام کی زبانوں میں اپنا تعارف کرایا۔ پھر حتمی طور پر جب تہذیب و تمدن انسانی کے پروان چڑھنے کا زمانہ قریب آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس علم الہام کو جو عرصہ دراز سے انسانی تہذیبوں کو منتقل کیا جا رہا تھا، اسے تکمیل کی راہ پر ڈال دیا۔ آج سے ۱۴۸۴ برس قبل علم الہام کو اس کے عروج پر پہنچا کر اس کی تکمیل کر دی اور اس کے ساتھ ہی صاحبانِ الہام کی ضرورت باقی نہ رہی، کیونکہ تکمیلِ الہام کے بعد تکمیلِ نبوت بھی ہو گئی۔ اب نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ الہام۔ دروازۂ الہام اور نبوت کو بند کر کے اللہ تعالیٰ نے اس پر مہر ثبت کر دی اور حضرت انسان کو بتا دیا کہ وہ اصول اور قوانین جو آخری الہامی کتاب قرآن اور جناب خاتم الانبیاء کے ذریعہ سے ان کو منتقل کر دیے گئے ہیں اب وہی حتمی قوانین ہیں جو رہتی دنیا تک اولادِ آدم کو انسانیت کی راہِ معراج کی طرف گامزن کرتے رہیں گے۔

اب جو بھی اس راہ کا سفر اختیار کرے گا وہ عملِ خیر کو پا کر عملِ شر سے دور رہے گا۔ لہٰذا

اس آخری الہامی کتاب جو ہمارے لیے دستورِ حیات کا درجہ رکھتی ہے اور اس کتاب کو عملی جامہ پہنانے کے بعد سکھانے والے نبی رحمتؐ ہمارے اعلیٰ ترین استاد ٹھہرے۔ ان دونوں کی سربراہی میں آنے والے مسلمان کہلائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے اپنی گردن رکھ دینے والے لوگ۔ یہ لوگ اللہ اور اس کے نبیؐ پر جو یقین رکھتے ہیں اس کو ایمان کہا جاتا ہے۔ اور یہ لوگ اپنے ایمان کا اقرار کرنے سے پہلے ان تمام خداؤں کی نفی کرتے ہیں جن کی دنیا میں پرستش ہو رہی ہوتی ہے۔ یعنی ان کا اقرارِ ایمان ان کے انکار سے شروع ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ اللہ ہے اور ہم اس کی پرستش کرتے ہیں، بلکہ وہ انکار کرتے ہیں ان تمام نام نہاد خداؤں کا جن کی معاشرے میں پرستش ہو رہی ہوتی ہے، ان ہر طرح کے خداؤں کے تصورات کو اپنے ذہن سے بالکل صاف کر دیتے ہیں اور پھر اس صاف شدہ ذہن پر یہ نقش کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس کا اقرار کرتے ہیں اور پھر اس بات کا اعلان بھی کر دیتے ہیں کہ:

"کوئی نہیں ہے إلٰہ (یعنی پرستش کے لائق) سوائے ایک اللہ کے"۔

اس طرح سے وہ تمام مروجہ خداؤں کو تسلیم کرنے کا انکار کرتے ہیں اور پھر اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ان کا اور تمام کائنات کا اور جو کوئی بھی اس میں ہے ان سب کا خالق اور مالک صرف اللہ ہی ہے اور صرف اسی کی ذات پاک پرستش کے لائق ہے اور پھر اس کے اور اس کی بھیجی ہوئی کتاب اور بھیجے ہوئے رسولؐ کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنے کا اعادہ بھی کرتے ہیں۔ اور یہی پوری کائنات کی مخلوقِ اعلیٰ کے لیے راہِ ہدایت ہے اور یہی اقرارِ ایمان کا بنیادی عقیدہ ہے جسے ایک مسلمان اپنے دل و دماغ میں بسا لیتا ہے۔ اور اسی بات کا اقرار اور اعلان بھی کرتا ہے۔ جب یہی اعلان عالمیات محمدؐ نے اپنی قوم کے سامنے کیا اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کام کے لیے منتخب کیے گئے ہیں کہ وہ اس اعلان کو عام کریں اور عوام الناس کو اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تابع کر دیں جس میں سب سے بڑا پیغام یہ تھا کہ وہ جن جن خداؤں کی پرستش کرتے ہیں وہ دراصل خدا نہیں ہیں، لہٰذا وہ ان تمام کی خدائی کی نفی کر کے ان سے منہ موڑ لیں اور پھر ایک اللہ جو واحد اور احد ہے اس کی واحدانیت، الوہیت اور ربوبیت کا اقرار کر کے صرف اسی کی پرستش کریں اور اپنی

زندگی کے دیگر پہلو اسی کے حکم کے مطابق اپنائیں۔ اور پھر اس بات کا اقرار بھی کریں کہ محمدؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، لہٰذا ان کی مکمل پیروی کرنا بھی ان پر ضروری ہوگا۔

بس یہی وہ اعلان تھا جسے سننے کے بعد اہل مکہ آگ بگولا ہو گئے۔ کیونکہ انھیں اپنے بتوں سے شدید الفت تھی، لہٰذا انہوں نے جناب محمد ﷺ کی شدید ترین مخالفت کی اور آپ ﷺ کو طرح طرح کی تکالیف دیں۔ جب وہ کسی بھی طرح سے جناب محمدؐ کو ان کے ارادے سے باز نہ رکھ سکے تو آخر کار سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ آپؐ کو قتل کر دیا جائے، کیونکہ وہ ان کے خداؤں کی توہین کرتے ہیں۔

لہٰذا ایمان پر یقین اور اس کا بنیادی عقیدہ اس اعلان اور یقین کے ساتھ ہوگا کہ ”کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کی پرستش کی جائے، سوائے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ کے اور یہ کہ عالیجناب محمدؐ اللہ کے رسول ہیں“۔

یہ ایک ایسا اعلان ہے جس کا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی غلامی قبول کر لیتا ہے۔ اور اس کی غلامی کا طوق اور لگام پہن کر ایمان والوں کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہاں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے قوانین اور زندگی گزارنے کے طور طریقے سیکھتا ہے اور پھر ان پر عمل پیرا ہو کر دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اُس پر لازم ہوگا کہ وہ اپنے ایمان اور یقین کے تمام پہلوؤں پر بھی غور کرے تاکہ وہ ایمان کامل کو جان کر اس کی صحیح تقلید کر سکے۔ صرف اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا گویا ایمان کا بنیادی پہلو ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایمان کا تعارف ہے۔ مضمون کی تفصیل تو ابھی ہمیں سیکھنا ہے۔ اور اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا فرمان مبارک دیکھنا ہوگا، جس کا ہمیں قرآن کے ذریعے سے پتا چلے گا اور اس کی مزید تشریح جناب رسول اللہ ﷺ کے فرمان مبارک اور اعمال سے معلوم ہوگی۔

۱ (iii) ایمان کا بیان (قرآن و حدیث کی روشنی میں)

قرآن الحکیم کی سورہ بقرہ (۲) کی آیت (۳-۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

”وہ لوگ جو ایمان لائے غیب پر، اور قائم کرتے ہیں صلوٰۃ (پانچ وقت نماز) اور خرچ کرتے ہیں (اللہ کی راہ میں) ہمارے (اللہ) کے دیے ہوئے مال میں سے“۔ (۳)

”اور وہ جو ایمان لاتے ہیں اس (قرآن) پر جو تمہاری طرف (رسول اللہ ﷺ پر) اُتارا گیا اور وہ (الہام) جو اس سے قبل (انبیاء پر) اتارا گیا۔ اور وہ یقین رکھتے ہیں آخرت (روز قیامت) پر“۔ (۴)

”یہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے رب کی طرف سے اور یہی فلاح اور نجات پانے والے ہیں“۔ (۵)

ان آیاتِ مبارکہ میں لفظ غیب سے مراد وہ تمام مابعد الطبیعاتی علوم ہیں جن کا ادراک عقل اور حواس سے ممکن نہیں۔ مثلاً ذاتِ باری تعالیٰ، آسمان، جنت، دوزخ، عرش، ملائکہ، احوالِ قبر اور احوالِ قیامت اور علم الہام وغیرہ۔ ان تمام باتوں کا علم جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے کافی اور مناسب سمجھا وہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور آخر میں اپنے آخری رسول عالیجناب محمد ﷺ کے ذریعے سے اولادِ آدم تک پہنچا دیا اور اس کے علاوہ وہ علم بھی بتا دیا جو صحیح زندگی کے لیے ہماری راہیں متعین کرتا ہے۔ اور ہمیں اس امتحان میں سرخرو کرتا ہے جو ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے۔ اور اسی امتحان کے واسطے اللہ تعالیٰ نے ہمارے جدِ امجد کو زمین پر بھیجا۔

انہی آیاتِ کریمہ میں لفظ 'خرچ' سے مراد ان آیات سے اگلی آیات میں واضح کر دی گئی ہے۔ مثلاً اسی سورہ بقرہ کی آیت (۸۳) اور (۱۱۰) وغیرہ۔ ان آیت شریفہ میں اور اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی یہ بتا دیا گیا ہے کہ خرچ کرو اپنے ماں باپ پر، اپنے اہل یعنی گھر والوں پر، اپنے عزیز و اقرباء پر، یتیموں پر، مساکین پر، مسافروں پر، غلاموں اور قیدیوں پر، اور ان پر جو سوال کرتے ہیں۔ اس امر کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ ماں، باپ یعنی والدین کے ضمرے میں تمام مائیں اور باپ آتے ہیں، یعنی والد کے والدین، والدہ کے والدین، ان کا خیال کرنا اور ان پر خرچ کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ والدین پر خرچ کرنا۔ اور اسی طرح سے اہل کا مطلب ہے گھر والے ان میں اولاد کی اولاد بھی شامل ہے، ان کا خیال رکھنا بھی اہل میں ہی آتا ہے۔

خرچ کرنے کا حکم اتنا وسیع دائرہ رکھتا ہے کہ اس میں منشاء رب العزت یہ ہے کہ معاشرے

کا ہر فرد اہلِ ثروت کی ذمہ داری بن جائے تاکہ کسی بھی معاشرے میں دکھ، درد، اور بھوک کم سے کم ہو جائیں اور معاشرہ ایک خاندان کی حیثیت اختیار کر جائے اور ساتھ ہی ساتھ اہل ثروت انسانوں کی جانچ بھی ہو جائے کہ وہ اپنے بھائی بندوں کا خیال کرتے ہیں یا نہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی ابتدا میں ہی ایمان کو موضوع بنا لیا ہے۔ اس بات سے ہمیں ایمان کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہو جانا چاہیے۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم سب سے پہلے ایمان کی بابت جانیں اور پھر ایمان کامل کے ساتھ کتاب اللہ کو پڑھیں اسے سمجھنے کے لیے غور و خوض کریں اور پھر اسی ذوق و شوق کے ساتھ اس کے احکامات پر عمل کریں۔

قرآن کے نہایت جید مفسر امام ابن کثیرؒ نے مختلف حوالوں کے ساتھ ایمان کے بارے میں لکھا ہے کہ ایمان کسی بات پر یقین کرنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''میں ایمان لایا'' تو اس قول کا مطلب ہوا کہ میں نے اس بات پر یقین کامل کر لیا جس کے بارے میں مجھے بتایا جا رہا ہے اور جس کے بارے میں میں ایمان لایا اور ان تمام باتوں کی تفصیل جن پر ایمان لانا ضروری ہے اس سے پہلے سورہ بقرہ کی آیت (۳ تا ۵) میں بیان کی جا چکی ہے۔

الزاہری نے کہا کہ ایمان (اُن) اعمال کو کہتے ہیں (جو یقین کے ساتھ کیے جائیں)۔

الربیع بن اُنس نے کہا کہ کسی کا یہ کہنا کہ ''وہ ایمان لایا'' ... اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ڈرا (اللہ سے)۔ یعنی اس نے تقویٰ اختیار کیا، یعنی پرہیزگاری اختیار کی، لہٰذا ایمان کی تعریف اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بتائی ہوئی باتوں پر عین یقین کے ساتھ عمل کرنا ہی ایمان لانا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول پر، لہٰذا ایک مسلمان کے ایمان کا طبع یہ ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل درست ہے، اور ہم اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کو اللہ کا حکم مانتے ہیں۔ اس لیے اس عقیدے کو ایمان کہنا درست ہوگا جب ایک مسلمان اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کا پابند ہو جاتا ہے تو پھر وہ اللہ کا تابعدار بندہ بن جاتا ہے اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی رضا کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی تابعداری اختیار کیے رہتا ہے۔ اور وہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی سے وہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دے

گا، جو وہ کبھی بھی نہیں کرنا چاہے گا۔

اب ان اعمال کو اپنانے کے بعد ایمان کی تعریف کا دائرہ کچھ مزید وسیع ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو الٰہ، خالق اور رب مان کر یعنی اللہ تعالیٰ کی الٰہیت، خالقیت اور حاکمیت تسلیم کر لینے کے بعد یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیاء، اس کی بھیجی ہوئی کتابیں، اس کا پیغام اس کے رسولوں تک پہنچانے والے فرشتے، ان سب پر ایمان لانا بھی لازم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جب ہم نے اللہ کے نبیؐ کے بتائے ہوئے زندگی گزارنے کے قواعد اور قوانین بھی تسلیم کر لیے اور ان پر عمل کرنا شروع کر دیا تو پھر جزا اور سزا کا تصور بھی تسلیم کرنا ہوگا اور پھر اس کے تسلیم کرنے کے بعد یوم حساب پر یقین خود بخود لازم ہو جائے گا۔ جس کے بعد زندگی بعد از موت کا عقیدہ جنم لے گا اور وہاں کا ٹھکانہ جنت یا جہنم بھی قبول کرنا ہوگا۔ اس طرح سے یہ تمام اصول اور قوانین عقائد کی صورت میں ہمارے ایمان کا حصہ بن جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمان مبارک ہے سورہ توبہ (۹) کی آیت (۶۱) میں کہ:

''وہ (رسول) اللہ پر ایمان رکھتا ہے، اور مسلمانوں کی باتوں کا یقین کرتا ہے، اور تم میں سے جو اہلِ ایمان ہیں یہ ان کے لیے رحمت ہے (یعنی رسول اللہؐ)''۔

آیتِ مبارکہ کے اس حصے میں جو بیان کیا گیا ہے، ظاہر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لانا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا پانا ہے۔ کیونکہ اللہ کا رسول ہمیں برائی سے منع کرتا ہے اور اچھائی کی طرف راغب کرتا ہے۔ جس کے ذریعے ہم دوزخ سے بچ کر جنت کی طرف مائل ہوتے ہیں، یہی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔

سورہ یوسف (۱۲) کی آیت (۱۷) میں ایمان کا مطلب بتایا گیا ہے کہ یوسف کے بھائیوں نے حسد کی وجہ سے انہیں مارنے کے لیے کنویں میں ڈال دیا اور واپس گھر آ کر اپنے والد کو ایک من گھڑت کہانی سنائی کہ یوسف کو ایک بھیڑیا لے گیا ہے۔ لیکن کیونکہ وہ اپنے قول میں جھوٹے تھے اس لیے انہوں نے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ: ''لیکن آپ تو ہم پر کبھی یقین نہ کریں گے، گو کہ ہم سچے ہی ہوں''۔

اس آیتِ شریفہ میں لفظ یقین کے لیے ''بِمُؤْمِنٍ'' استعمال ہوا ہے، یعنی ایمان نہیں

لائیں گے، کا مطلب یقین نہیں کریں گے۔ لہٰذا ایمان کا واضح مطلب یقین ہوا۔

جب یقین کامل ہو گیا تو پھر ایمان لانے کے بعد اعمال صالح کرنا بھی لازم ہو گیا۔ جیسا کہ سورہ التین (۹۵) کی آیت (۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''وہ لوگ جو ایمان لائے (اٰمَنُوْا) اور (پھر) نیک عمل بھی کیے (عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے''۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اعمال صالح کے بغیر ایمان یا یقین ادھورا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایمان کا تقاضا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی مکمل تابعداری کی جائے۔ چنانچہ ایمان اور عمل آپس میں لازم و ملزوم ٹھہرے۔ اس کے علاوہ ایمان اور اعمال دونوں خشیت سے جڑے ہوئے ہیں۔ خشیت کا مطلب ہے اللہ کی ناراضی کا خوف، جیسا کہ سورہ الملک (۶۷) کی آیت (۱۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''بے شک وہ لوگ جو ڈرتے ہیں (یَخْشَوْنَ) اپنے رب سے اَن دیکھے، ان کے لیے ہے مغفرت اور بڑا اجر''۔

اس سلسلے میں سورہ ق (۵۰) کی آیت (۳۳) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''جو ڈرتا ہے رحمٰن سے (مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ) جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا (یعنی جو لایا غیب پر ایمان) (بے شک) اس کا قلب توجہ والا ہے (یعنی ایسے لوگوں کا دل معافی کی طرف مائل رہتا ہے)۔ اس کے لیے (قَلْبٍ مُّنِیْبٍ) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والا، اطاعت گزار دل۔

اب یہاں پر ایمان کامل کے واسطے ایک اور ضروری وصف سامنے آیا ہے، یعنی ایمان کامل کے لیے ہے عمل صالحہ اور اس کے لیے ضروری ہے خشوع۔ اور ایمان بھی ہو غیب پر۔ لہٰذا اب ایمان کو اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے یا یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ عقیدہ ایمان کی تعریف یہ ہوگی کہ:

''اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ صفات اور اس کے ہونے پر ایمان، اس کے پیغمبر آخر جناب محمد ﷺ پر ایمان اور ان پر نازل شدہ کتاب قرآن پر ایمان (ساتھ ہی پہلے تمام انبیاء اور

کتابوں پر ایمان) فرشتوں پر ایمان، قیامت کے دن پر ایمان، سزا و جزا پر ایمان یعنی جنت و دوزخ پر ایمان''۔ یہ تمام کے تمام ایمان کے جزو ہمارے لیے غائب ہیں۔ ان تمام عقائد پر ایک مسلمان کو اس طرح سے یقین لانا ہے جیسا کہ ایمان لانے والا شخص ان سب چیزوں کو حقیقت میں جانتا ہو۔ اس طرح سے یقین کرنے کو ایمان بالغیب کہا جاتا ہے۔

امام ابن کثیرؒ نے سورہ بقرہ کی آیت (۳) کی تفسیر میں لفظ ''غائب'' کے موضوع پر دو احادیث نقل کی ہیں، جن کا یہاں شامل کرنا ہمارے ایمان کے لیے باعث تقویت ہوگا، ان شاء اللہ۔

حدیث نمبر ۱۔ ابو جمعہ انصاری نے کہا کہ: ''ہم جناب نبی کریم ﷺ کے ہمراہ کل دس افراد تھے جن میں معاذ بن جبل بھی شامل تھے۔

ہم نے کہا: اے اللہ کے نبیؐ! کیا (ہمارے بعد) ایسے لوگ بھی ہوں گے جنہیں ہم سے بہتر اجر ملے گا؟ (کیونکہ) ہم ایمان لائے اللہ پر اور آپؐ کی اطاعت کی۔

فرمایا جناب نبی کریمؐ نے: تمہیں ایسا کرنے سے کس نے روکا ہے، جبکہ اللہ کا رسول تمہارے درمیان موجود ہے اور تمہارے لیے الہام لاتا ہے آسمان سے؟ (نہیں) تمہارے بعد ایسے لوگ آئیں گے جنہیں ایک کتاب ملے گی دو جلدوں کے درمیان (یعنی قرآن) اور وہ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کے احکامات پر عمل پیرا رہیں گے۔ ان کے لیے ہے بڑا انعام تمہاری نسبت بلکہ دوگنا'' ... سبحان اللہ۔

دوسری حدیث امام احمدؒ نے نقل کی ہے جو روایت کی ہے ابن محیریز (Muhayriz) نے، اور کہا: میں نے ابو جمعہ انصاریؓ سے کہا کہ: ہمیں کوئی حدیث بیان کرو، جو آپ نے جناب رسول کریم ﷺ سے سنی ہو۔

انہوں نے کہا: ہاں! میں تمہیں سناؤں گا ایک اچھی حدیث، کہ:

''ایک مرتبہ ہم کھانا تناول کر رہے تھے جناب رسول کریم ﷺ کے ساتھ، تو ابو عبیدہ جو ہمارے ساتھ تھے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا لوگ ہم سے بہتر بھی ہوں گے کہ ہم اسلام لائے آپ کے ساتھ اور جہاد میں حصہ لیا آپ کے ساتھ۔

اس پر جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ہاں! وہ لوگ تمہارے بعد آئیں گے۔ جو مجھ پر

ایمان لائیں گے، حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہ ہوگا۔

امام بخاریؒ نے لکھا کتاب الایمان میں کہ فرمایا جناب نبی کریم ﷺ نے کہ اسلام پانچ بنیادی ارکان پر مشتمل ہے۔ جبکہ ایمان یہ ہے کہ اس کا اقرار کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے اور یہ کہ ایمان کی حالت ایک بندے میں بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے (کیونکہ جب بھی کوئی ایمان والا ایمان کے خلاف کوئی کام کرتا ہے تو اس وقت وہ ایمان سے عاری ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ نیک کام کرتا ہے اس کا ایمان بڑھتا رہتا ہے۔

اس سلسلے میں سورہ الفتح (۴۸) کی آیت (۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"وہی ہے (یعنی اللہ) جس نے مسلمانوں کے قلوب میں سکینت اور اطمینان ڈالا، تاکہ (وہ) اپنے ایمان کے ساتھ اور بھی ایمان میں بڑھ جائیں"۔

سورہ الکہف (۱۸) کی آیت (۱۳) میں فرمایا کہ:

"یہ اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید ترقی دی تھی"۔

سورہ المدثر (۷۴) کی آیت (۳۱) میں فرمایا کہ:

"تاکہ ایمان والوں کے ایمان میں اور اضافہ ہو جائے"۔

اور فرمایا نبی رحمت ﷺ نے کہ "اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت اور اُسی کی خاطر نفرت کرنا ایمان کا حصہ ہے"۔

ایمان ہی کے متعلق جناب عمر بن عبدالعزیزؒ نے عدی بن عدی کو ایک مرتبہ خط میں لکھا کہ: "ایمان میں شامل ہیں فرائض، قوانین اور حدود (جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر فرمائے ہیں)، اور اس کے علاوہ اعمال بھی۔ اور جو کوئی بھی ان سب کی تقلید کرے گا اس کا ایمان مکمل ہوا اور جو کوئی بھی ان کی تعمیل نہ کرے گا اس کا ایمان نامکمل ہے اور اگر میں زندہ رہا تو میں ان سب کے متعلق تمہیں بتاتا رہوں گا۔ اور اگر میں فوت ہو گیا تو مجھے کچھ شوق نہیں ہے تمہارے ساتھ رہنے کا۔

سورہ بقرہ (۲) آیت (۱۷۷) میں بتایا گیا ہے کہ جس شخص میں درج ذیل خوبیاں ہوں گی وہ سچا اور صحیح ایمان والا ہوگا۔

"ساری اچھائی مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنے میں ہی نہیں (یہودی بیت المقدس کے مغربی حصے، جبکہ نصاریٰ مشرقی حصے کو اپنا قبلہ مانتے اور اس پر فخر کرتے تھے اور ساتھ ہی جب مسلمانوں کا قبلہ کعبہ کو بنایا تو اس کو بھی یہودیوں نے موضوع بحث بنا لیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نماز کے لیے کسی جانب رُخ کرنا اصل بات نہیں ہے بلکہ اصل بات اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے) بلکہ حقیقت میں اچھا شخص وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتاب پر اور انبیاء پر ایمان رکھنے والا ہو۔ جو مال سے محبت کرنے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والے کو دے، غلاموں کو آزاد کرے، نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ ادا کرے، جب وعدہ کرے تب اسے پورا کرے، تنگدستی، دکھ درد اور لڑائی کے وقت صبر کرے۔ یہی ہیں سچے لوگ اور یہی متقی یعنی پرہیزگار ہیں"۔

صحیح بخاری کے مطابق جناب ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ "یقین ہی مکمل ایمان ہے" جبکہ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ: کوئی شخص کامل پرہیزگار نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنے دل سے تمام شک و شبہات نہیں نکال دیتا (اپنے ایمان کے بارے میں)۔

جناب ابوہریرہؓ نے کہا کہ فرمایا عالیجناب رسول اللہ ﷺ نے کہ:

"قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی بھی ایمان والا نہ ہوگا جب تک کہ وہ مجھ سے محبت نہ کرے، اپنے والد اور بچوں سے زیادہ"۔

جناب عمرؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

"مجھے حکم دیا گیا ہے (اللہ کی طرف سے) کہ میں لڑوں ان لوگوں کے خلاف، جب تک کہ وہ یہ شہادت نہ دیں کہ کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ ان کی پرستش کی جائے، سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اور قائم کرے صلوٰۃ اور ادا کرے زکوٰۃ۔ اور اگر وہ سب کچھ کر لیں تو پھر انہوں نے بچا لیں اپنی زندگیاں اور جائیداد مجھ سے۔ سوائے اس کے کہ کوئی اسلامی قانون آڑے نہ آئے۔ اور پھر ان کا حساب (اعمال کا حساب) اللہ تعالیٰ کے پاس لکھا جائے گا"۔

۲۔ اللہ پر ایمان

۲ (1) ۔تاریخ اولادِ آدم میں تصورِ خدا

تاریخ مذاہب عالم سے پتا چلتا ہے کہ خدا کا تصور ہمارے جدِ امجد جناب آدمؑ اور حواؑ کے ساتھ ہی آیا۔ لیکن یہ تصور پہلے سے ہی غیر شعوری طور پر دنیا کی ہر موجودات میں تھا جبکہ شعوری طور پر جنات میں موجود تھا۔ لیکن ہمارا موضوع صرف انسانوں کے حوالے سے ہے۔ چنانچہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں جہاں الہامی علم کا شعور تھا وہاں وہاں عقیدہ اول یہی تھا کہ ہمارا مالک، خالق اور رازق وغیرہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے اور ہمیں صرف اسی ذات کی پرستش کرنی لازم ہے۔ اس لیے الہامی علم کی موجودگی میں کبھی بھی تصورِ خدا انسان کے لیے موضوع زیرِ بحث نہیں رہا۔ اس موضوع کے لیے بحث کی ضرورت صرف وہاں پڑی جہاں الہامی علم موجود نہیں تھا، اگر موجود تھا تو انسانوں کے ایک گروہ میں اس کا شعور نہ تھا اور نہ ہی ان کے دانشوروں نے اس کے متعلق غور کرنے کی تکلیف گوارا کی۔ لہٰذا یہ گروہ طاغوتی طاقتوں کے زیرِ اثر رہ کر علمِ الہام سے دوری اختیار کر گیا اور آج بھی دور ہے۔

طاغوتی طاقتوں کا ہمیشہ یہ مشن رہا ہے کہ وہ ہمہ وقت انسانوں میں شر پھیلائیں، اور انہیں اللہ کے راستے پر آنے سے روکیں اور گمراہی کی طرف گامزن کریں۔ یہ شر اس وقت بھی نہایت چابکدستی سے کام کرتا رہا جبکہ پیغمبر لوگوں کے درمیان موجود تھے۔ مثال کے طور پر جب موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے طلب کرنے پر طور پر گئے تو اپنے لوگوں کے درمیان اپنے بھائی ہارون کو چھوڑ گئے کہ وہ قوم کی نگرانی کرتے رہیں کہ کہیں وہ طاغوتی طاقتوں کے شکنجے میں نہ آجائے۔ لیکن قومِ موسیٰ کی بدبختی کہ وہ پیغمبر کی موجودگی میں ہی پیغمبر کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹک گئے اور اللہ تعالیٰ کو بھول کر ایک بے جان بچھڑے کے بت کو پوجنا شروع ہو گئے۔

چونکہ ابلیس جناب آدمؑ کو اپنی ذلت کی وجہ سمجھتا تھا اس لیے اس نے اللہ تعالیٰ سے اجازت لے کر یہ قسم اٹھائی کہ وہ ہمہ وقت اولادِ آدم کو بہکاتا رہے گا اور اسے راہِ راست سے ہٹاتا رہے گا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کے لیے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس کے تابعدار بندے ابلیس کی قربت سے ہمیشہ دور رہیں گے اور جو نادان ابلیس کے کہنے میں آجائیں گے وہ روزِ قیامت ابلیس کے ساتھ جہنم رسید کر دیے جائیں گے۔

چنانچہ دنیا میں یہ چوہے بلی کا کھیل روزِ اول سے ہی شروع ہو گیا تھا اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ یہ معاملہ اولادِ آدم کے لیے آزمائش کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جناب آدمؑ و حواؑ کو زمین پر اُتارا ہی اس لیے تھا کہ اللہ انہیں اور ان کی اولاد کو آزمائش سے گزارے اور پھر ان میں سے اپنے تابعدار بندوں کو منتخب کر کے جنت میں واپس پہنچائے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کو آدمؑ اور اولادِ آدم سے بے انتہا محبت ہے اس لیے وہ نہیں چاہتا کہ یہ اس کی فرمانبرداری سے انحراف کر کے جہنم کا ایندھن بن جائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ہر قوم کے لوگوں میں اپنا ایک خاص بندہ بھیجا جسے اللہ تعالیٰ نے خاص عقل اور شعور کے علاوہ اپنی طرف سے علمِ خاص کی آگاہی بخشی، تاکہ وہ اپنی قوم کو جہالت کے اندھیرے سے نکال کر ایمان کے نور کی طرف مائل کرے۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قوانین سے آگاہی بخشے تاکہ وہ طاغوتی راستے سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ اس الہامی علم کا سب سے اہم موضوع اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکت ہی رہی اور یہ کہ اس کائنات اور اس کی ہر ایک مخلوق کو کسی نے تو بنایا ہوگا، جو اس کا نظام چلا رہا ہے۔ اور اسی کے ہاتھ میں ہے فنا اور بقاء، زندگی اور موت، اور وہی اپنی مخلوق بکر اں کو روزی مہیا کرتا ہے۔ اور وہی ان کے نیک اعمال کا اجر دے گا اور بُرے اعمال کی سزا دے گا اور اس کا حکم کائنات اور اس کی ہر چیز پر چلتا ہے۔ اور کوئی بھی کام اس کے لیے مشکل نہیں ہے۔

لہٰذا اولادِ آدم جو شرف اور دانش کے لحاظ سے اعلیٰ ترین قرار دی گئی ہے اس پر یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے مالک کو پہچانے اور اس کے بھیجے ہوئے نبی کو بھی پہچانے اور اس کی دی

ہوئی کائنات کی کتاب کو سمجھے اور اس پر عمل کر کے اپنے مالک کا تابعدار بندہ بن جائے اور اس طرح سے اللہ کی قربت حاصل کرے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ انسان کو فوت ہونے کے بعد جس سوال کا سامنا کرنا پڑے گا، وہ یہ ہوگا کہ ''تمہارا رب کون ہے؟'' اس لیے جو کوئی بھی اپنے آپ کو شیطانی قوتوں سے بچائے رکھے گا اور اللہ تعالیٰ کی تابعداری اختیار کیے رہے گا، اس کے لیے روزِ قیامت نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ طاغوتی طاقتوں اور ان کے نمائندوں نے ہمیشہ خدا کے تصور کو غلط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اولادِ آدم کو اپنی اس ٹھوکر کبیر سے گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر قوم میں اپنے انبیا کو اپنے علمِ الہام کے ساتھ بھیجا تاکہ طاغوتی ٹھوکر کبیر کا تدارک کیا جائے۔ لیکن ایسے پیغامات کو ماننا تو درکنار نافرمان قوموں نے انبیا کرام کو شدید اذیتیں پہنچائیں، کچھ کو شہید بھی کیا اور اپنی بداعمالیوں پر بحیثیت قوم قائم رہے۔ لہٰذا نتیجہ کے طور پر انہیں اللہ تعالیٰ تباہ کر کے ان کی جگہ دوسری اقوام کو لے آئے جیسے قومِ صالحؑ، قومِ لوطؑ، قومِ نوحؑ وغیرہ وغیرہ۔

اب ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں کہ کس طرح سے ابلیس نے اپنی گھناؤنی ٹھوکر کو پھیلانا شروع کیا اور اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے کس انداز میں اپنی مخلوقِ اعلیٰ کی مدد فرمائی۔ سب سے پہلے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ آدمؑ و حواؑ کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو شدید حسد کی بناء پر قتل کر دیا اور اس طرح سے دنیا میں یہ سب سے پہلی اور سب سے بدترین خلاف ورزی ہوئی اللہ تعالیٰ کے احکام کی۔ بلکہ یوں کہنا بھی بجا ہوگا کہ اس دنیا میں ابلیس اولادِ آدم پر ایک گہرا گھاؤ لگانے میں کامیاب ہوگیا۔ اور اولادِ آدم میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ابتدا ہوگئی۔

اس کے بعد تاریخ انسانی میں ایک ایسا دور آیا کہ اولادِ آدم کو ایک اور طاغوتی چال نے آگھیرا۔ وہ یہ کہ اس کے دل میں خیال ڈال دیا کہ وہ ان دیکھے خدا کی کیوں کر پرستش کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے خدا کا تصور قائم کر کے یا تو لوگوں کی پرستش شروع کر دی جو نہایت طاقتور اور ظالم تھے یا ایک تصوراتی خدا کے روپ میں بت تراشنے شروع کر دیے اور انہیں خدا تصور کر کے پوجنا شروع کر دیا۔ یہ ٹھوکر دنیا میں ابھی تک موجود ہے۔ اولادِ آدم کی بدبختی کہ آج

بھی اس اکیسویں صدی عیسوی میں ایک صد کروڑ لوگ ایسے ہیں جو بتوں کے پجاری ہیں۔ وہ آج بھی سائنسی ارتقاء کے ساتھ اور انسان کی انتہائی اپنی نشوونما کے ساتھ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ صنم جنہیں وہ خود اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہیں، جو نہ بول سکتے ہیں، نہ اپنی جگہ سے ہل سکتے ہیں، بلکہ ان کی عاجزی کی انتہا تو یہ ہے کہ مکھیاں ان پر اپنی غلاظت ڈالتی ہیں تو نہ تو وہ مکھی کو ہٹا سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی غلاظت صاف کر سکتے ہیں۔ کیسے بے عقل لوگ ہیں کہ پھر بھی اس گھٹیا ترین چیز کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

چنانچہ جب آدمؑ کے بعد بت پرستی عام ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے نوحؑ کو بھیجا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائیں اور ان کی اصلاح کریں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی بندگی پر مائل کریں تاکہ وہ عذاب سے بچ سکیں۔ لیکن وہ بدبخت قوم جناب نوح علیہ السلام کی نو صد سالہ تلقین کے باوجود اپنی جہالت پر قائم رہی اور جناب نوحؑ کے بھی خلاف ہوگئی۔ جب وہ لوگ اس نافرمانی میں پختہ ہوگئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب بھیج کر سب کو غرقِ آب کر دیا اور نوح علیہ السلام اور ان کے چند ساتھیوں کو بچا لیا، جنہوں نے یکسوئی کے ساتھ پاکیزہ زندگی شروع کی اور آنے والی نسل کو راہ راست دکھائی۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ طاغوتی طاقتیں پھر سے سر اٹھانے لگیں اور نوحؑ کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ابلیس پھر سے لوگوں کو بہکانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں تک کہ بت پرستی کی قبیح ترین بیماری اولادِ آدم میں پھر سے سرایت کر گئی اور پھر ان نافرمانوں میں سے ایک شخص نمرود جو ان کا بادشاہ بھی تھا خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا۔ اب اس جھوٹے اور بے وقوف انسان نے اور اس کے پیروکار بت پرستوں نے مل کر بت پرستی کا دامن تھام لیا اور یوں ابلیس کے شکنجے میں پھر سے آگئے اور اپنے مالکِ حقیقی سے دور ہو کر گمراہی کے گڑھے میں گر گئے۔ اب پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی عزیز ترین مخلوق کو گمراہی سے بچانے کے لیے اپنا ایک نمائندہ رسول ایک بت تراش کے گھر پیدا کر دیا۔ ان کا نام جناب ابراہیم خلیلؑ ہے اور ان کو مقرر کیا کہ وہ پھر سے بت پرستی کا قلع قمع کر کے ان گمراہ لوگوں کو راست بازی کی طرف لے کر آئیں۔ اس طرح سے جناب ابراہیم خلیلؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے ایک بیٹے

اسماعیلؑ کو عرب کے صحرا میں چھوڑ دیا اور بیت اللہ کو دوبارہ اسی جگہ تعمیر کیا جہاں یہ پہلے سے موجود تھا۔ جناب اسماعیلؑ اس بیابان کے بدوؤں کی تربیت کرتے رہے جہاں آپؑ کے بعد آپ ہی کی اولاد میں سے عالیجناب رسول امینؐ نے جنم لیا اور نبی آخر الزماں ﷺ ہونے کا اعزاز پایا۔ جبکہ جناب خلیلؑ کے دوسرے بیٹے اسحاقؑ نے یروشلم جہاں کے جناب ابراہیم خلیل رہنے والے تھے، اس مقام کو اپنا ٹھکانہ اور قوم کی تربیت گاہ بنایا اور پھر جناب رسول کریم ﷺ سے پہلے تک جتنے بھی انبیاء دنیا میں تشریف لائے وہ سب کے سب جناب اسحاقؑ کی اولاد میں سے ہی تھے اور یہ سب بنی اسرائیل کہلائے۔

ان کی بدبختی کہ یہ لوگ کافی عرصہ گزرنے کے باوجود دوبارہ ابلیس کے پیروکار بن گئے اور راہِ حق کی تقلید چھوڑ دی اور نتیجہ کے طور پر یہ قوم بنی اسرائیل، مصر کے فرعونوں کی غلام بن گئی اور ان کا ظلم وستم سہنا ان کا مقدر بن گیا۔ فرعونی بادشاہوں کا ظلم وستم ان کے لیے بڑھتا گیا، کیونکہ فرعون بادشاہ نے خدائی کا دعویٰ بھی کر رکھا تھا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ کو اسرائیلیوں پر رحم آگیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی تربیت اور تقویت کے لیے ان میں سے ہی اپنا ایک نبی پیدا فرمایا۔ اور یہ انتظام بھی فرمایا کہ اس نبی کی پرورش فرعون کے گھر میں ہی ہو، کیونکہ اسی نبی نے فرعون کو دعوتِ حق دینا تھی۔ کیونکہ فرعون کا ظلم بد سے بدتر ہو گیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے نافرمان اور ظالم بادشاہ کو اس کی قوم سمیت سزا سے ہمکنار کیا اور بنی اسرائیل کو آزادی مل گئی اور وہ دینِ حق کے داعی بھی بنا دیے گئے۔

لیکن قوم بنی اسرائیل کو یہ عزت کچھ زیادہ عرصے تک راس نہ آئی اور اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں شروع کر دیں حتیٰ کہ شرک میں بھی ملوث ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو گمراہی سے بچانے کے لیے پھر ایک نبی عیسیٰؑ کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ بنی اسرائیل کو طاغوتی قوتوں سے چھٹکارا دلا سکیں۔ لیکن بہت کم لوگ ہی راہِ راست اختیار کر سکے جبکہ کچھ لوگوں نے جناب عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی ٹھان لی اور اپنی طرف سے انہیں قتل کر دیا۔ لیکن ان کے پیروکار بڑھتے رہے اور دینِ حق کا پرچار کرتے رہے، یہاں تک کہ ابلیس نے ان پر ایک وار کاری کیا اور انہیں باور کرا لیا کہ عیسیٰؑ یا تو اللہ کے (نعوذ باللہ) بیٹے ہیں یا خدا ہیں۔ یہ

شرک کی ناقابلِ معافی کیفیت ہے۔ اس طرح سے اہلِ نصاریٰ شرک کی بہت بڑی گمراہی میں پڑ گئے۔ یہاں تک کہ جناب عیسیٰؑ کے تقریباً ساڑھے پانچ صد برس بعد اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کی کامل رہنمائی کے لیے نبی آخر الزماں ﷺ کو بھیجا اور بتا دیا کہ اب یہ آخری موقع ہے اور ان کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا۔ اور رہتی دنیا تک اللہ تعالیٰ کا یہی پیغام انسانوں کے لیے صراطِ مستقیم کا فریضہ انجام دے گا۔ اب نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی نیا قانون۔ کیونکہ اب اولادِ آدم کے امتحان کا وقت ختم ہونے والا ہے۔ اور ان کے امتحان کا نتیجہ بھی عنقریب آنے والا ہے اور اس دن کو روزِ حساب یا روزِ قیامت کہا گیا ہے۔ تاکہ فرمانبرداروں کے لیے انعام واکرام اور نافرمانوں کے لیے سزا کا بندوبست کیا جائے۔

۲ (ii) ۔خدا کے وجود کے چند عقلی دلائل

دنیا کے دانشمند لوگ اس موضوع پر زمانہ قدیم سے یہ بحث کرتے چلے آئے ہیں کہ خدا کا وجود ہے اور وہ اسے ثابت کرنے کے لیے مختلف دلائل دیتے رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سے ایسے بھی گزرے ہیں جو ان دلائل کے خلاف دلائل دے کر ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ خدا کا وجود نہیں ہے۔ کسی نے خدا کی ہستی کا نام Nature بھی رکھ دیا۔ لیکن ۱۷ ویں صدی عیسوی کے ایک فرانسیسی فلاسفر (Rene Descartes) نے اپنے ہونے کو خدا کے ہونے کا ثبوت قرار دے دیا۔ اس نے کہا کہ اس کا وجود اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ایک ایسی ذات موجود ہے جس نے اسے پیدا کیا اور وہی خدا ہے۔ اس نے ان الفاظ میں خدا کے ہونے کا اقرار کیا اور کہا کہ:

"کیونکہ میں ہوں، اس لیے خدا بھی ہے"۔ اس کے کہنے کا مطلب تھا کہ اس کی ذات کی موجودگی اور اس کے ارگرد دیگر طرح طرح کی مخلوقات اور ایک وسیع کائنات کی موجودگی یہ سوال کرتی ہے کہ ان سب عجائبات دنیا و آسمان کا خالق کون ہے، ان سب کو ایک مقرر قانون پر چلانے والا کون ہے۔ ان کو کون زندگی دیتا ہے اور کون ان کو مارتا ہے، کون ان کی پرورش کرتا ہے، وہ جو کوئی بھی ہے وہ ہی خدا ہے۔

گو کہ ڈیکارٹ کی باتوں میں بہت وزن تھا لیکن پھر بھی نہ ماننے والے نہ مانے۔

پھر اٹھارویں صدی عیسوی میں ایک اور شخص آیا جس کا نام Immanual Kant ہے، اس نے کہا کہ اگر تمام دانشور لوگ مل کر یہ بات ثابت کر دیں کہ خدا کا وجود ہے تو میں دلائل کے ذریعہ سے ہی ان کی اس بات کو رد کر دوں گا۔ اور اگر یہ لوگ یہ ثابت کر دیں کہ خدا کا وجود نہیں ہے تو میں دلائل کے ذریعہ ان کی بات کو بھی رد کر دوں گا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ ہمیں دنیا میں اخلاقی اقدار کو قائم رکھنے کے لیے یہ بات مان لینی چاہیے کہ خدا موجود ہے، ورنہ یہ دنیا اور اس کے انسان اخلاقیات سے عاری ہو جائیں گے اور یہ دنیا برائیوں کی آماجگاہ بن کر رہ جائے گی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس دنیا کے لوگ بیک وقت اچھائیوں اور برائیوں میں مصروف ہیں۔ کچھ لوگ دنیا میں بھلائی اور امن قائم کرنے میں کوشاں ہیں اور کچھ لوگ ان کے برعکس فساد کرتے ہیں، لوگوں کا امن و چین چھینتے ہیں، برائیوں کو عام کرتے ہیں اس لیے ان اچھے اور بُرے لوگوں کو ان کا بدلہ تو ملنا چاہیے۔ اگر ہم اس بات سے انکار کرتے ہیں تو پھر برائی پھیلے گی اور اچھائی ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ تصور اولاد آدم میں رہنا ضروری ہے کہ کوئی ایسی ہستی موجود ہے جو برائی کرنے والوں کو سزا اور اچھائی کرنے والوں کو انعام دے گی۔ لہٰذا ہمیں اخلاقی اقدار کو قائم رکھنے کے لیے یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ خدا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے مطابق وہ کون سی ہستی ہے جس نے گھاس کی ایک معمولی اور نہایت چھوٹی سی پتی میں کلوروفل بنانے کا ایک کارخانہ لگا رکھا ہے، جو گھاس کی نشوونما کا باعث بنتا ہے؟

یہ ہے گھاس کی پرورش کا عمل، اور یہ عمل اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا نظام ربوبیت حرکت میں آتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جب اپنی کسی بھی مخلوق کو پیدا فرماتا ہے تو پھر اس کی پرورش کرتا ہے اور پھر اس کے عروج پر آنے کے بعد اس کو ختم کر دیتا ہے۔ پرورش کا نظام اور اس کے اصول عجیب ہیں، اگر اس پر غور کیا جائے تو حیرت انگیز انکشافات ہوتے ہیں۔ آپ ذرا غور فرمائیں کہ پیپل یا بوہڑ یا ایسے کئی اور درخت جو نہایت مضبوط اور قد آور ہوتے ہیں ان کے بیج نہایت چھوٹے ہوتے ہیں۔ یعنی خشخاش کے دانے سے بھی مختصر۔ ان کے اندر یعنی ہر ایک بیج کے اندر ایک نہایت بڑا اور قد آور درخت پنہاں ہوتا ہے، بس اس ذرہ برابر بیج کو چاہیے کچھ مٹی اور پانی اور دیکھیے اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کہ اس میں سے ایک تن

آور درخت برآمد ہوتا ہے۔ اس بیج سے درخت بننے تک کا جو عمل ہوتا ہے اسی کو پرورش کیا جاتا ہے اور پرورش کا یہی اصول ہر ذی روح مخلوق کے لیے ہوتا ہے اور اس اصول کو بنانے والی ہستی کا نام خدا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مختلف مخلوقات کی پرورش کے لیے خلیوں (Cells) کی بے شمار اقسام پیدا فرمائی ہیں، ہر خلیہ بذاتِ خود ایک جاندار ہوتا ہے۔ اور مختلف قسم کے جانداروں میں مختلف قسم کے خلیے ہوتے ہیں اور اس جاندار کی جسمانی ساخت کے لحاظ سے اس کے مختلف اعضا یا حصوں کے خلیات بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک درخت کے تنے کے، پتوں کے، جڑوں کے اور اس پر کھلے ہوئے پھول اور پھلوں کے الگ الگ خلیات ہوتے ہیں۔ اور ان میں پھر پھل کے بھی کئی حصے ہوتے ہیں، ان میں بیج کے اور گودے کے اور جلد کے الگ خلیے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے انسانی اعضاء کے بھی مختلف خلیات ہوتے ہیں۔ مثلاً ہڈیوں کے خلیے، جلد کے خلیے، دماغ کے خلیے، جگر کے اور، دل کے اور گردوں کے اور۔ یعنی ہر اعضاء کے مختلف خلیے ہوتے ہیں۔ آپ انسان کے جسم کو دیکھیے اس سے زیادہ پیچیدہ مشین اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ پھر اس جسم کے نظام کو زندہ رکھنے کے لیے بے شمار نہایت پیچیدہ نظام ہے۔ پھر دیکھیں پرندوں سے انڈے نکالنا اور ان انڈوں سے بچے۔ کیا یہ تمام پیچیدہ ترین نظام بغیر کسی ہستی کے چل سکتے ہیں؟ کوئی تو ہے جو اس پیچیدہ کروڑوں بلکہ ان گنت نظام ایک ساتھ ہی چلا رہا ہے، وہی ہے ایک ہستی جسے خدا کہتے ہیں۔

پھر اتنی بڑی کائنات، زمین کا گردش کرنا اپنے گرد اور سورج کے گرد اور اسی طرح سے دیگر بہت سے سیاروں اور ستاروں کا گردش کرنا، کہیں رات کا ظہور تو کہیں دن، کہیں گرمی تو کہیں سردی، کہیں بارش کہیں خشک سالی، کہیں زلزلے اور کہیں طوفان۔ یہ اتنا بڑا نظام کون چلا رہا ہے۔

بہار کے موسم میں درخت سر سبز ہو جاتے ہیں، ان میں پہلے پھول لگتے ہیں، پھر ان میں پھل لگتے ہیں۔ یہ پھل شروع میں نہایت کڑوے یا کسیلے ہوتے ہیں، بعد میں ان کی کڑواہٹ کھٹاس میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر وہی کھٹاس مٹھاس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ کون ہے جو ان میں شکر بھر دیتا ہے۔ ان میں طرح طرح کے رنگ بھرتا ہے، خوشبو بھرتا

ہے، انھیں لذت سے کون مزین کرتا ہے۔ پھر دیکھیں کہ پانی کے جانور کس طرح پانی میں زندگی پاتے ہیں، پرندے کس طرح سے اڑان بھرتے ہیں، ایک ذرا سی لوہے کی سوئی پانی میں ڈوب جاتی ہے جبکہ لاکھوں ٹن وزنی لوہے کا جہاز پانی پر تیرتا ہے۔ ہوائی جہاز فضاؤں میں اڑان بھرتا ہے۔ یہ سارے اصول اور قوانین کس نے بنائے، وہ خدا کی ہستی ہے۔

پھر وہی انسان ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ان کے مختلف رنگ، مختلف جسامتیں، مختلف زبانیں، ان کا قلم سے لکھنا اور لکھے ہوئے کو پڑھنا یہ سب کچھ کس نے سکھلایا، اسی ہستی کو خدا کہا جاتا ہے۔ آپ صرف ایک لمحہ پھر غور کریں تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ ایک ایسی ہستی ہے جو یہ تمام کا تمام پیچیدہ ترین نظام چلا رہی ہے اور اسے خدا کہتے ہیں۔ اور اس خدا نے علم الہام کے ذریعہ اپنے نبی آخر الزماں ﷺ کو اپنا مبارک نام اللہ بتلایا ہے۔

۲ (iii) لفظ 'اللہ' کے متعلق بیان

خالق و مالک کائنات جسے فارسی اور اردو میں خدا اور انگریزی میں God کہتے ہیں عربی زبان میں یہ نام اللہ ہے۔ یہ نام خاص ہے خدا تعالیٰ کی ذات پاک کے لیے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام ہیں۔ اسی نام اللہ کو اسم اعظم بھی کہا جاتا ہے۔ لفظ "اللہ" کی کوئی تذکیر یا صیغہ نہیں ہے، یعنی نہ یہ مذکر ہے اور نہ ہی مؤنث، نہ واحد ہے اور نہ ہی جمع، بلکہ یہ نام احد ہے یعنی اکلوتا ہے صرف ایک۔ اور اس جیسا اور کوئی نام نہیں، اس نام کی خوبی یہ ہے کہ اگر اس کا کوئی حرف ہٹا لیا جائے تو بھی اس کا مطلب نہیں بدلتا، مثلاً لفظ اللہ کے حروف ہیں ا ل ل ہ۔

اگر ا ل ل ہ سے پہلا حرف 'ا' ہٹا لیا جائے تو رہ جائے گا "ل ل ہ" یعنی "لِلّٰہ" جس کا مطلب ہے اللہ کا یا اللہ کے لیے۔ پھر "ل ل ہ" سے پہلا حرف 'ل' ہٹا لیا جائے تو رہ جائے گا ل ہ یعنی "لَـــہٗ" جس کا مطلب ہے "اس کا" یعنی اللہ کا۔ اب "ل ہ" سے بھی پہلا حرف "ل" ہٹا لیا جائے تو رہ جائے گا صرف "ہ" اور اس پر جب پیش لگا دی جائے تو بن جاتا ہے (ھُو) جس کا مطلب ہے وہ ہے (یعنی اللہ ہے)۔

تو یہ ہے اعجاز لفظ اللہ کا، جو خاص اسم گرامی پاک ہے اللہ تعالیٰ کا۔ اسی لیے اسے اسم اعظم کہا جاتا ہے، یعنی سب سے اعلیٰ نام۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ رحمٰن (۵۵) کی آخری آیت (۷۸) میں فرمایا کہ:

"برکت والا نام ہے تمہارے رب کا جو عزت اور جلال والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے بارے میں فرمایا ہے کہ "تمہارے رب کا نام بڑی برکت والا ہے" (سورہ رحمٰن کی آخری آیت)۔ یہ لفظ اللہ کسی اور لفظ سے اخذ بھی نہیں کیا گیا ہے، کچھ لوگوں نے بنا لیا غیر مسلمانوں نے کہا ہے کہ یہ لفظ ال+الٰہ کا مرکب ہے۔

عربی زبان میں لفظ 'ال' انگریزی کے "THE" کے مترادف ہے۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ 'ال' کے حروف صرف اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسماء کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً الرحمٰن۔ الرحیم، الرزاق، الصمد، الکریم وغیرہ۔ جب ان اسماء کے ساتھ حروف ال لگا دیے جاتے ہیں تو پھر یہ نام خاص اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ کے ساتھ خاص ہو جاتے ہیں اور یہ تمام صفاتی نام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اسم مبارک کے متعلق چیلنج کیا ہے اور فرمایا سورہ مریم (۱۹) کی آیت (۶۵) میں کہ:

"کیا تم کوئی دوسرا نام جانتے ہو جو اس کے برابر ہو، یا اس جیسا ہو یا اس کا اس سے (لفظ اللہ) مقابلہ کیا جائے"۔

دوسرے مذاہب کے لوگ حتیٰ کہ اہل کتاب بھی 'اللہ' کو مسلمانوں کا خدا کہتے ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت پوری کائنات اور تمام انسانوں اور دیگر مخلوقات کا خدا ہے۔ اہل کتاب کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کے لیے اور اپنے لیے علیحدہ علیحدہ خدا مقرر کریں کیونکہ اس طرح سے وہ اللہ تعالیٰ کی واحدانیت سے ہی منکر ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہود و نصاریٰ بھی مسلمانوں کے ساتھ دین ابراہیمی پر قائم کیے گئے ہیں۔ جناب ابراہیم خلیلؑ اور ان کی تمام اولاد (انبیاء) اللہ ہی کو خدا مانتے ہیں۔ اور اہل کتاب اس بات کو جانتے ہیں کہ وہ دین ابراہیمی کے پیروکار رہیں۔ اسی وجہ سے تو اہل یہود نے (جو مدینہ کے مکین تھے) جناب رسول کریمؐ سے سوال کیا تھا کہ وہ کون سا دین لے کر آئے ہیں۔ اس کے جواب میں جناب نبی کریمؐ نے فرمایا تھا کہ "میں دین ابراہیم لایا ہوں"۔

اس سلسلے میں سورہ بقرہ (۲) کی آیات (۱۳۲۔۱۳۳) میں فرمایا گیا ہے کہ "اور وصیت

کی ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوبؑ نے بھی یہ کہا کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے پسند فرمایا ہے اس دین کو تمہارے لیے۔ (تو) خبردار! تم مسلمان ہی مرنا"۔ (۲:۱۳۲)

پھر دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ یہود سے سوال کیا اور فرمایا:

"کیا یعقوبؑ کے انتقال کے وقت تم موجود تھے؟ جب انہوں نے اپنی اولاد سے پوچھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ تو سب نے جواب دیا کہ آپ کے معبود کی اور آپ کے آباء ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی۔ جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے"۔ (۲:۱۳۳)

اس کے بعد سورہ طٰہٰ (۲۰) کی آیت (۱۴) میں فرمایا گیا:

"بے شک! میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا عبادت کے لائق اور کوئی نہیں۔ پس تم میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو"۔ (یہ خطاب جناب موسیٰؑ سے کیا گیا)۔

سورہ النمل (۲۷) کی آیت (۹) میں فرمایا کہ:

"اے موسیٰؑ! میں کہ بات یہ ہے کہ میں ہی اللہ ہوں (ہر شے پر) غالب اور حکمت والا"۔

سورہ القصص (۲۸) کی آیت (۳۰) میں فرمایا کہ:

"اے موسیٰ! یقیناً میں ہی اللہ ہوں، سارے جہانوں کا پروردگار"۔

سورہ جاثیہ (۴۵) کی آیات (۳۶-۳۷) میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"پس تمام حمد و ثناء اور شکر صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے لیے سزاوار ہے۔ جو مالک ہے زمین اور آسمانوں کا، تمام کائنات اور اس کی ہر مخلوق کا"۔ (۳۶)

"اور تمام تر کبریائی صرف اسی کے لیے ہے زمین اور آسمانوں میں۔ اور وہی ہے زبردست قوت اور حکمت والا"۔ (۳۷)

سورہ الحدید (۵۷) کی آیات (۱ تا ۳) میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"حمد و ثناء کرتی ہے اللہ کی، ہر چیز، جو موجود ہے زمین اور آسمانوں میں اور وہ تمام تر قوت کا مالک ہے اور دانائے کل ہے"۔ (۱)

"اُسی کی ہے بادشاہی زمین اور آسمانوں میں، اور وہی ہے جو عطا کرتا ہے زندگی اور

دیتا ہے موت، اور وہ ہر کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے"۔ (۲)

"وہی ہے اول، اور وہی ہے آخر، وہی ہے ظاہر، وہی ہے باطن، اور وہی ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یعنی نہ تو اس سے پہلے کچھ تھا، اور جب کچھ باقی نہ رہے گا تو صرف اس کی شان کریمی ہی باقی رہے گی۔ اور وہی ظاہر ہے یعنی اُسی کا غلبہ سب پر عیاں ہے کہ وہ کس طرح سے اپنی مخلوق کو مجبور کر دیتا ہے، اور وہی ان باتوں کو جانتا ہے، جو ہم سے پوشیدہ ہیں"۔ (۳)

۲ (۱۷) اللہ تعالیٰ پر ایمان (قرآن کی روشنی میں)

سورہ بقرہ (۲) کی آیت (۲۸۵) میں مکمل ایمان کا ذکر کیا گیا ہے۔

"ایمان لایا رسولؐ اس پر جو اس کی طرف نازل کیا گیا اللہ کی طرف سے۔ اور مومن بھی ایمان لائے۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر۔ (اور) اس کے رسولوں میں سے ہم کسی میں تفریق نہیں کرتے اور انہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔ ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں، اے ہمارے ربّ! اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹ کے جانا ہے"۔

اب اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد سورہ الحمد یعنی سورہ الفاتحہ (۱) کی آیات (۲-۳) میں ایمان کے متعلق مزید فرمایا گیا ہے کہ:

"تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو ربّ (مالک) ہے تمام جہانوں کا"۔ (۲)

اس آیت شریفہ میں تخصیص کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ ہر قسم کی تعریف کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کیونکہ وہی پیدا کرتا ہے، پھر وہی نشوونما کرتا ہے اور زندگی کی تکمیل کرتا ہے۔ کیونکہ مخلوق کی زندگی کے لیے یہ ضروری امر ہے کہ ہمہ وقت اس کی پرورش یعنی نشوونما کی جائے، یعنی اس کی مسلسل نگہداشت کی جائے اور اس نگہداشت کو ہی پرورش کہتے ہیں، اس فعل کو سوائے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی القدر کے کوئی اور نہیں کر سکتا اور یہی اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ اسی لیے ربّ کہلاتا ہے۔ ربّ کا مطلب ہے کسی چیز کا مالک ہونا، اور اللہ کا اپنی خلق کا مالک ہونے کے ساتھ اس کی پرورش بھی کرنا۔

پھر فرمایا کہ "وہ (اللہ) رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی"۔ (۳)

کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی شان کی صفتِ ربوبیت یعنی اس کی صفت پالنے کی، رزق عطا کرنے کی اور دیگر ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ذاتِ پاک میں صفاتِ رحمانیت بدرجۂ اتم موجود ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اس دنیا کی تمام مخلوق پر رحم فرماتا ہے بغیر یہ دیکھتے ہوئے کہ کون اس کا تابعدار اور فرمانبردار ہے اور کون نافرمان۔ لیکن آخرت کی زندگی میں ایسا نہ ہوگا۔ بلکہ وہاں پر اللہ تعالیٰ رحمٰن کی بجائے رحیم بن جائے گا۔ کیونکہ وہاں پر اس کا رحم صرف اس کے تابعدار بندوں کے لیے ہوگا، نافرمانوں کے لیے نہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے: رحمان فی الدنیا و رحیم فی الآخرہ۔

سورہ البقرہ (٢) کی آیت (١٣٦) میں ایمان لانے کی تاکید کی گئی ہے فرمایا ہے کہ:

''اے مسلمانو! تم سب کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی (یعنی قرآن)۔ اور جو چیز ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ اللہ کی طرف سے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء کو دیا گیا (یعنی الہامی علم اور کتابیں)۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے (اور) ہم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں''۔

یعنی اس بات پر ایمان لایا جائے کہ تمام انبیاء اور رسل اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے گئے پیغمبر ہیں، قابلِ احترام ہیں اور ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے جو وحی بھیجی خواہ زبانی، روحانی یا کتابی صورت میں وہ سب کا سب قابلِ احترام کلام ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یہ کسی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ پیغمبروں کے درمیان کسی قسم کی درجہ بندی کریں۔

پھر سورہ البقرہ (٢) کی آیت (٢٥٥) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اللہ ہی ہے معبودِ برحق، اور اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے اور ہمیشہ کے لیے رہنے والا ہے۔ اور وہ قائم رکھتا ہے اور حفاظت کرتا ہے (یعنی تمام مخلوق کی)۔ اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اُسی کا ہے جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین پر۔ وہ کون ہے جو اس سے سفارش کرے اس کے اِذن کے بغیر؟ وہ جانتا ہے کہ اس کی مخلوق کے ساتھ کیا ہوتا ہے اس دنیا میں اور کیا ہوگا آخرت کی دنیا میں۔ اور لوگ جان نہیں سکتے کسی چیز کو جو اللہ کے علم میں ہو (یعنی علم الغیب) سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔ اس کی کرسی زمین اور آسمانوں پر محیط ہے اور وہ کبھی تھکتا نہیں اپنی مخلوق کی حفاظت سے، اور وہ بہت اعلیٰ اور عظیم ہے''۔

پھر فرمایا آیت (٢٥٦) میں کہ:

''دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں، بے شک سچا راستہ غلط راستے سے الگ پہچانا جاتا ہے اور جو کوئی بھی طاغوت (ہر وہ شے اللہ کے سوا جس کی کافر پرستش کرتے ہیں یا اس سے حاجت روائی کرتے ہیں وہ طاغوت کے زمرے میں آتی ہے) سے انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے پا لیا سہارا، جو قابلِ بھروسا ہے اور کبھی نہ ختم ہوگا اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے باور کرا دیا ہے کہ یہ بات انسانوں پر منحصر ہے اور ان کی مرضی اور اختیار ہے، اس بات کا کہ وہ دینِ اسلام اختیار کریں یا نہ کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اجداد کو اس اختیار کے ساتھ ہی دنیا میں بھیجا تھا کہ وہ اور ان کی اولاد چاہے تو اللہ کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کرے یا طاغوتی قوتوں کے راستے پر۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو تو وہی راستہ پسند ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ اور ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ اچھے کام یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا اچھا اجر اور نافرمانی کی شدید سزا ملے گی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں دینِ حق رکھ دیا ہے۔ مثال کے طور پر کسی شخص کو نہ تو نبی کا پیغام ملا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی کتاب ملی، تو اس کے لیے لازم ہوتا کہ وہ دینِ فطرت اختیار کرے۔ دینِ فطرت میں ہر وہ کام کرنا جائز ہوتا ہے جس کے کرنے میں انسان کو شرمندگی اور ندامت محسوس نہ ہوتی ہو۔ بلکہ خلافِ فطرت کام کرنے میں ہر شخص کو چاہے وہ عالم ہو یا جاہل، چاہے اسے کسی نبی کا پیغام ملا ہو یا نہ ملا ہو، ایک خاص قسم کی شرم اور خوف محسوس ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ خلافِ فطرت کام چھپ کر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ بات ہر کسی کی فطرت میں داخل ہوتی ہے کہ وہ چوری نہ کرے، جھوٹ نہ بولے، وہ جانتا ہے کہ کسی کی جان لینا اچھی بات نہیں، وہ اخلاقیات کی حدود کو بھی جانتا ہے۔ اس لیے ہر انسان کے لیے لازم ہے کہ اگر اسے الہامی علم نہ ملے یا کسی بات کا فیصلہ کرتے وقت الہامی علم کے متعلق جاننے کے لیے اس کے پاس ذرائع نہ ہوں تو وہ پھر قانونِ فطرت جو اس کی جبلّت میں اللہ تعالیٰ

نے محفوظ کر دیا ہے اس سے فائدہ حاصل کرے۔

اس کے بعد والی آیت (۲۵۷) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اللہ ولی ہے (یعنی مددگار ہے) ایمان والوں کا، اور وہ نکالتا ہے ان کو اندھیروں (یعنی کفر اور جہالت کے اندھیروں) میں سے روشنی (ایمان اور علم کی روشنی) کی طرف۔ اور جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر، ان کے مددگار ہیں طاغوت جو انہیں نور (ایمان) سے نکال کر لاتے ہیں (کفر کے) اندھیروں کی طرف۔ اور وہ لوگ جہنمی ہیں جو ہمیشہ اس میں رہیں گے"۔

سورہ المائدہ (۵) کی آیت (۸۴۔۸۵) میں اللہ تعالیٰ نے ہر ایمان لانے والے کا صلہ اور آیت (۸۶) میں ایمان نہ لانے والوں کا انجام بتایا ہے۔

فرمایا گیا ہے کہ:

"اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اور ہم تمنا کرتے ہیں کہ ہمارا رب داخل کرے گا ہمیں صالح لوگوں کے ساتھ"۔ (۸۴)

اس آیت کریمہ میں حق کے دو مطلب سمجھ میں آتے ہیں، ایک تو نبی جنہیں اللہ نے حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، تاکہ وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہدایت دنیا کے لوگوں تک پہنچائیں اور دوسرا حق الہام یعنی قرآن ہے جو نبی علیہ السلاۃ والسلام نے ہمیں پہنچایا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ جو لوگ اللہ، اس کے رسول اور اس کی کتاب پر ایمان لائیں گے اُن کو ان لوگوں کا ساتھ دیا جائے گا جو صالح ہوں گے۔ یعنی انہیں جنت میں بھیجا جائے گا، جہاں صرف صالحین ہی مکین ہوں گے۔

پھر واضح طور پر آیت (۸۵) میں صالحین کے انعام و اکرام کا تذکرہ بھی فرما دیا۔

"پس جو کچھ انہوں نے کہا (اپنے ایمان کے متعلق) اس کے عوض اللہ عطا فرمائے گا انہیں باغات (جنت باغ کو ہی کہتے ہیں) جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہی صلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا (نیک کام حقیقت میں وہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی فرمانبرداری کے لیے کیے جائیں)"۔ (۸۵)

پھر اگلی آیت (۸۶) میں انکار کرنے والوں کے لیے فرمایا گیا ہے کہ:

"لیکن جو انکار کرتے ہیں ہماری نشانیوں سے وہ ہوں گے مکین جہنم کے"۔

اس ضمن میں صحیح بخاری میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے، جس کے راوی جناب معاذ بن جبلؓ ہیں کہ فرمایا جناب رسول کریم ﷺ نے:

"اے معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کے حقوق کیا ہیں اس کے بندوں پر؟" معاذؓ نے کہا: "اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں" ... پھر جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "صرف اُسی کی پرستش کرنا، اور عبادت میں اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کرنا"۔ پھر فرمایا: "کیا تم جانتے ہو کہ ان کے (بندوں کے) کیا حقوق ہیں اُس (اللہ) پر؟ میں نے کہا: "اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں"۔ تو جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ: "ان کو سزا نہ دینا"۔

۲ (۷) اللہ تعالیٰ کی چند بنیادی خصوصیات

اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف سورہ الحشر (۵۹) کی آیات (۲۲) تا (۲۴) تک میں کرایا ہے کہ:

"وہی ہے اللہ جس کے علاوہ کسی کا حق نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے۔ غیب کا علم رکھنے والا، اور وہ جو غیب نہیں، وہ اللہ ہے نہایت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا"۔ (۲۲)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ وہ علم جس کا اظہار اللہ تعالیٰ نے بندوں سے نہیں کیا وہ سب کچھ اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں علم رکھتا ہے۔ اس کے لیے کوئی چیز یا کوئی علم غیب نہیں۔ اس کی ذاتِ پاک سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی ذاتِ پاک منبع علم ہے۔ غیب تو صرف ہمارے لیے ہوتا ہے۔ جس علم کو اللہ تعالیٰ نے ظاہر نہیں کیا ہوتا وہ سب کے لیے غیب ہوتا ہے۔ اسے نہ کوئی پیغمبر جانتا ہے اور نہ کوئی فرشتہ۔

دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ:

"وہی اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی بھی پرستش کے قابل نہیں (وہ ہے) شہنشاہ، پاک ہر عیب سے، حفاظت مہیا کرنے والا اور نگہبانی کرنے والا اپنی مخلوق کی، تمام تر طاقت کا منبع، مجبور کر دینے والا، اعلیٰ ترین، ہر طرح کی تعریف صرف اللہ ہی کو سزاوار ہے، وہ ہر ایک سے اعلیٰ ہے جنہیں وہ شریک ٹھہراتے ہیں اس کا"۔ (۲۳)

"وہی اللہ ہے، تخلیق کرنے والا ہر شے کا، ایجاد کرنے والا اور ان کی اشکال اور جسم ترتیب دینے والا، اسی کے ہیں تمام اچھے اور اعلیٰ نام، اور جو کچھ بھی ہے آسمانوں میں اور زمین پر وہ اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور وہی ہے تمام تر طاقتور اور دانش مند"۔ (۲۴)

امام احمد بن حنبلؒ کے مطابق جب وہاں کفار نے جناب رسول کریمؐ سے کہا کہ وہ اپنے رب کی خصوصیات بتائیں اور ایک اور روایت کے مطابق کفارِ مکہ نے کہا کہ وہ (محمدؐ) کس اللہ کی بات کرتا ہے، ہمارا اللہ تو یہ ہے (انہوں نے کعبہ کے اندر رکھے ہوئے ایک بڑے بت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا)۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ مبارکہ کا تعارف کرانے کے لیے سورہ اخلاص (۱۱۲) نازل فرمائی۔ اخلاص کا مطلب ہے پاکیزگی۔

اس سورہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"کہو! وہ اللہ ہے اکیلا (آحد)"۔ (۱۔۱۱۲)

آحد کا مطلب ایسا واحد ہے جس کا کوئی دوسرا نہ ہو۔

"اللہ بے نیاز ہے (صمد)"۔ (۲)

صمد کا مطلب ہے ایسی ہستی جسے کسی چیز کی حاجت نہ ہو یعنی وہ ہر طلب سے بے نیاز ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ حاجت روا ہو اور دیگر سب اس کے محتاج ہوں۔

"نہ کسی نے اسے جنم دیا اور نہ ہی اس نے کسی کو جنم دیا"۔ (۳)

اس آیت کی تشریح کے لیے سورہ الانعام (۶) کی آیت (۱۰۱) سے مدد لیتے ہیں جس میں فرمایا ہے کہ:

"اللہ پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اس کے بچے کیوں کر ہو سکتے ہیں جبکہ اس کی کوئی صاحبہ ہی نہیں؟ اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔ (۶:۱۰۱)

سورہ اخلاص کی آیت (۳) کی مزید تشریح کے لیے سورہ مریم (۱۹) کی آیات (۸۸) تا (۹۲) کا ملاحظہ بھی ضروری ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور وہ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ مہربان ہستی (رحمان) کا بیٹا ہے"۔ (۸۸)

"بے شک تم (کافر لوگ) لائے ہو ایک نہایت بے ہودہ اور بری بات"۔ (۸۹)

"قریب ہے کہ اس قول کی وجہ سے آسمان پھٹ جائیں اور زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں"۔ (۹۰)

"اس لیے کہ انہوں نے بڑی عزت والے رحمٰن کے لیے بیٹا منتخب کیا"۔ (۹۱)

"اور یہ کہنا قطعاً مناسب نہیں کہ بڑی شان والے رحمٰن کی کوئی اولاد ہو"۔ (۹۲)

پھر سورہ اخلاص کی آیت (۴) میں فرمایا ہے کہ:

"اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے"۔ (۱۱۲:۴)

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک میں، نہ اس کی صفات میں اور نہ ہی اس کے افعال میں اس جیسا کوئی ہے۔ یعنی اس جیسی کوئی اور شے ہے ہی نہیں"۔

صحیح بخاری میں ایک حدیث قدسی نقل کی گئی ہے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ:

"انسان مجھے گالی دیتا ہے، یعنی میرے لیے اولاد ثابت کرتا ہے۔ حالانکہ میں ایک ہوں اور بے نیاز ہوں، میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ ہی کسی سے پیدا ہوا ہوں اور نہ ہی میرا کوئی ہمسر ہے"۔

صحیح بخاری میں ایک اور روایت کے مطابق فرمایا جناب نبی کریم ﷺ نے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اولادِ آدم نے مجھے جھٹلایا، جبکہ اسے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے مجھے گالی دی جبکہ اسے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے انکار کیا یہ کہہ کر کہ میں (اللہ) اسے دوبارہ زندگی نہ دے سکوں گا، جس طرح کہ میں نے اسے پہلے پیدا کیا۔ (حالانکہ) پہلی پیدائش دوبارہ زندہ کرنے سے کوئی آسان نہیں۔ اس نے گالی دی یہ کہہ کر کہ اللہ کا بیٹا ہے، جبکہ میں اکیلا ہوں، خود کفیل ہوں ہر معاملے میں۔ میں کسی کو جنم نہیں دیتا اور نہ ہی کسی نے مجھے جنم دیا اور کوئی بھی میری طرح نہیں ہے"۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ رحمٰن ہے اس نے مخلوق کو پیدا کیا پھر ان سب کی پرورش کرتا ہے، ان کی تربیت بھی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو حواس دیے، عقل دی۔ جبلت (Intution) دی۔ یعنی کچھ علم اس کی فطرت میں رکھ دیا۔ مثال کے طور پر مرغی کے انڈے سے جب چوزہ نکلتا ہے تو فطری طور پر اپنی چونچ زمین پر مارتا ہے جب کوئی کھانے

والی چیز اس کی چونچ میں آ جاتی ہے تو کھا لیتا ہے، ورنہ پھینک دیتا ہے۔

سب سے نیارہ نظری علم اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کیا ہے۔ پھر اعلیٰ ترین ذہن سے اسے نوازا ہے، اسے سوچنے، سمجھنے، سیکھنے اور سکھانے کی بھرپور صلاحیت بخشی ہے۔ جب اس کی علمی صلاحیت اپنی آخری حد کو چھو لیتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اسے علم الہام عطا فرماتے ہیں تا کہ وہ اپنے رب کا تابعدار بندہ بن کر شیطان کے شر سے محفوظ رہ سکے۔

یہ سب کچھ یعنی سارے انعامات اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو اپنی صفت رحمانیت کی وجہ سے عطا فرماتا ہے۔

۲ (vi) اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفت

(۱) توحید۔ توحید کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں واحدانیت۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ہستی اپنے آپ میں مکمل ہے یعنی مکمل ہے، یکتا ہے، اکیلا ہے، بے نیاز ہے کوئی اس کا ہمسر نہیں نہ اس کا کوئی شریک ہے کسی بھی لحاظ سے۔ وہ اکیلا خالق ہے ہر شے کا، اور اکیلا مالک ہے اپنی مخلوق کا اور صرف اسی کی کامل حکمرانی ہے زمین اور آسمانوں میں اور ان کے اندر یا باہر جو بھی مخلوق ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور صرف اُسی کی محکوم ہے۔ ان ساری صفات کا تقاضا یہ ہے کہ اب اس ہستی کی پرستش کی جائے۔ یعنی اس کے سامنے اپنی انکساری، عاجزی، بے کسی اور بے بسی کا اعتراف اپنی ذلیل ترین حالت میں آ کر کیا جائے اور اس حالت میں اس کی بڑائی بیان کی جائے اور اپنی حاجت روائی کے لیے صرف اسی کو پکارا جائے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شامل نہ کیا جائے، نہ اس کی پرستش میں اور نہ ہی کسی حاجت روائی کے لیے۔

اس بنیادی عقیدے کے بغیر ایمان ممکن نہیں اور یہی عقیدہ ایمان کی شرط اول ہے۔ پہلے زبان سے اور دل سے اس عقیدے کا اقرار کیا جائے۔ اس کا اعلان کیا جائے اور پھر اس عقیدے کے مطابق اپنی زندگی کے تمام اعمال کو پابند کیا جائے تو یہ ہوگا ایمان لانا، اللہ پر۔

سورہ آل عمران (۳) کی آیت (۱۸) میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی واحدانیت کا اعلان کیا اور گواہی دی ہے۔ اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اللہ، اس کے فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور وہ عدل کو قائم رکھنے والا ہے۔ اس غلبہ آور اور حکمت والے کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں"۔

ان تمام صفات میں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ کوئی مددگار نہیں، بس وہ اکیلا ہے۔ اس آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو عدل قائم رکھنے والا بتایا ہے۔ اکثر لوگ لفظ عدل کا مفہوم اور مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھ پاتے۔ وہ عدل سے مراد انصاف لیتے ہیں۔ اگر عدل کا مطلب انصاف ہے تو پھر یہ انصاف کا مطلب نہیں سمجھتے۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ اس لفظ کی کچھ وضاحت کر دی جائے۔

دراصل عدل کا مطلب ہے میزان کا قائم کرنا، یعنی Balance کا قائم کرنا۔ پھر لوگ میزان سے مطلب ترازو لیتے ہیں۔ یہ صرف ایک مطلب ہے، ورنہ میزان کے مطلب میں بہت وسعت ہے۔ لفظ میزان کا مطلب سمجھنے کے لیے سورہ رحمٰن (۵۵) کی آیت (۷) پر غور کرنا ہوگا، جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اسی (اللہ) نے آسمان کو بلند کیا اور اسی نے میزان قائم کیا"۔

ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ آسمان کے ساتھ ترازو کا کیا تعلق ہے۔ یہاں میزان کا مطلب ہے کہ اس دنیا کو، سورج اور چاند کو اور پورے نظام شمسی کے ساتھ پوری کائنات کو توازن میں رکھنا حقیقت میں اس کے میزان کو قائم کرنا ہے۔

مثلاً سورج خلاء میں قائم کیا گیا ہے، اور وہ ایک ہی جگہ ستیم ہے اور اپنے محور پر ہی گھومتا رہتا ہے۔ جبکہ سورج کے ذیلی سیارے جن میں زمین اور چاند بھی شامل وہ سب کے سب سورج کے گرد ایک مقررہ راستے پر گردش کرتے رہتے ہیں، ایک ہی مقررہ رفتار کے ساتھ۔ جبکہ ہر سیارہ اپنے محور کے گرد بھی گردش کرتا ہے، اسی طرح سے ہر سیارے کے اپنے ذیلی ستارے یا چھوٹے سیارے بھی ہوتے ہیں جو اپنے محور کے گرد گردش کرنے کے علاوہ اپنے سیارے کے گرد گردش کرتے ہیں جیسے زمین کے گرد چاند گردش کرتا ہے۔

تو گویا اس سارے نظام کی گردش کو قائم و دائم رکھنے کے نظام کو میزان قائم کرنا کہتے ہیں۔

اسی نظام کے تحت اللہ تعالیٰ نے ہر خلیے کو بنایا ہے، اس کا بھی اپنا محور ہوتا ہے اور اس محور کے گرد دوسرے خلیات گردش کرتے ہیں۔ اگر کسی خلیے میں میزان برقرار نہ رکھا جائے یا اس کے نظام کو توڑ دیا جائے یعنی اس کو اپنے محور سے ہٹا دیا جائے تو وہ تباہ ہو جائے گا۔ اسی قانون کی بناء پر ایٹم بم بنایا گیا ہے۔ یقیناً ایسے ہی جب اس کائنات کے نظام کو اس کے محور سے ہٹایا جائے گا تو پھر سارے سیارے آپس میں ٹکرا جائیں گے اور قیامت برپا ہو جائے گی۔

یہی اصول اللہ تعالیٰ نے انسان کی زندگی میں رکھا ہے کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر نہیں چلے گا اور اپنی زندگی کا نظام اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق نہیں گزارے گا تو گویا وہ اپنی زندگی کا میزان قائم نہ رکھ سکے گا، اور پھر تباہی اس کا مقدر بن جائے گی اور پھر وہ اپنی تباہی کے ساتھ اپنے اردگرد یعنی اپنے ماحول اور ساتھیوں کو بھی تباہ و برباد کر دے گا۔

لہٰذا ایک مسلمان کے لیے بلکہ ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں میزان قائم رکھے۔ اس کے بعد سورہ آل عمران (۳) کی آیت (۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"(صرف) اللہ ہی ہے کوئی معبود نہیں اس کے سوا وہ زندہ ہے اور اپنی مخلوق کا نگہبان ہے"۔

یہی الفاظ سورہ بقرہ (۲) کی آیت (۲۵۵) میں آئے ہیں۔ اور یہی الفاظ سورہ طٰہٰ (۲۰) کی آیت (۸) میں بھی آئے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کا اطلاق فرمایا ہے۔ پھر سورہ طٰہٰ (۲۰) کی آیت (۱۴) میں بیان ہوا کہ:

"بے شک میں ہی اللہ ہوں، اور میرے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ پس میری ہی عبادت کرو، اور میری یاد کے لیے صلوٰۃ (پانچ وقت نماز) قائم کرو"۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ الانبیاء (۲۱) کی آیت (۲۴) میں سوال کرتے ہیں:

"کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں، ان سے کہہ دو (اے محمدؐ) کہ اپنی دلیل پیش کرو (اس بارے میں)"۔

پھر اسی سورہ کی آیت (۲۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"تجھ سے پہلے بھی جو رسول ہم نے بھیجا اس کی طرف (بھی) یہی وحی نازل کی کہ:

"میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، پس تم سب میری ہی عبادت کرو"۔ (۲۱:۲۵)

پھر سورہ القصص (۲۸) کی آیت (۳۰) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر موسیٰؑ کو فرمایا:

"اے موسیٰ! یقیناً میں ہی اللہ ہوں، سارے جہانوں کا مالک"۔

۴ (vi) (ب) توحید الٰہی کی اقسام

(1) توحید الوہیت

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد اس بات پر ایمان لانا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی پرستش کے قابل اور حق دار ہے۔ لہٰذا صرف اُسی کی بندگی اور اُسی کی حقیقی تعریف کی جائے اور صرف اُسی کے سامنے سربسجود ہو کر اس کی بڑائی بیان کی جائے۔ اور اپنی حاجت روائی بھی کی جائے، اس سے مدد طلب کی جائے، اس سے اپنی تکالیف بیان کی جائیں اور پھر اس کے فضل اور کرم کی درخواست کی جائے۔ اسی کے لیے خیرات کی جائے، اسی کے لیے روزہ رکھا جائے، نذر گذاری جائے، حج کیا جائے، قربانی کی جائے اور صرف اُسی کی خاطر کسی سے محبت کی جائے اور دشمنی بھی اُسی کی خاطر کی جائے۔ اور معافی بھی صرف اُسی کی خاطر دی جائے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی پرستش کی جاتی ہے، جن سے مدد مانگی جاتی ہے اور پریشانی میں جنہیں اللہ کے سوا پکارا جاتا ہے یا جن کو اللہ کا شریک ٹھہرایا جاتا ہے یا تابعداری اور فرمانبرداری کے علاوہ کسی کا اللہ سے رشتہ ٹھہرایا جائے، یہ سب کچھ ظلم عظیم ہے۔ اب اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کے فرمودات مبارکہ بیان کیے جاتے ہیں تاکہ سند قائم ہو جائے۔

سب سے پہلے تو سورہ اخلاص کا بیان اس سلسلے میں نہایت اہمیت کا حامل ہے جس کا تذکرہ گزشتہ عنوان میں آچکا ہے لہٰذا قرآن الحکیم کی دیگر چیدہ چیدہ آیات کریمہ کا بیان درج کیا جاتا ہے۔

(۱) سورہ الانبیاء (۲۱) کی آیت (۸۷) میں بیان ہے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے:

"مچھلی والے کو یاد کرو! جبکہ وہ غصے سے چل دیا، اور خیال کیا کہ ہم اسے نہ پکڑ سکیں گے۔ بالآخر وہ اندھیروں کے اندر سے پکار اٹھا کہ الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بیشک میں ظالموں میں ہو گیا"۔

پھر اگلی آیت (۸۸) میں فرمایا اللہ تعالیٰ نے:

"تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے غم سے نجات دے دی، اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح بچا لیا کرتے ہیں"۔

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر یونسؑ کا ذکر فرمایا ہے، جو اپنی قوم کو تلقین کرتے رہے، ایمان کی۔ لیکن وہ نہ مانی، آخر کار جناب یونسؑ اپنی قوم سے ناراض ہو کر اپنی قوم کو چھوڑ کر وہاں سے نکل آئے۔ چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت یا حکم کے بغیر آئے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں مچھلی کے پیٹ میں ڈال دیا۔ اور وہی اندھیرے ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں جناب یونسؑ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو وہ اللہ تعالیٰ سے ایک مدت تک معافی مانگتے رہے، جو آخر کار قبول ہوئی اور آپ پھر اپنی قوم کے پاس واپس گئے۔

گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مثال اور واقعہ کو بیان فرما کر یہ ہمیں بتایا ہے کہ اگر ہم غلطی کر جائیں تو فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں تو اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرما دیں گے۔

پھر اسی سورہ الانبیاء کی آیت (۱۰۸) میں فرمایا ہے کہ:

(۲) "کہو (اے نبیؐ) میرے پاس تو بس وحی کی جاتی ہے کہ تم سب کا معبود ایک ہی ہے تو کیا تم بھی اس کی فرمانبرداری کرو گے؟"۔

(۳) سورہ بقرہ (۲) آیت (۱۶۳) میں واضح کیا گیا ہے کہ:

"تم سب کا معبود ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی معبود برحق نہیں۔ (اور) وہ بہت رحم کرنے والا اور مہربان ہے"۔

اسی سورہ کی آیت (۱۸۶) میں فرمایا کہ:

"جب میرے بندے تم سے (نبیؐ سے) سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں (اور) ہر پکارنے والے کی پکار کو جب بھی وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں۔ اس لیے لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں، یہی ان کی بھلائی کا باعث ہے"۔

(۴) سورہ الاعراف (۷) آیت (۶۵) میں فرمایا کہ:

"اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ انہوں نے کہا: اے میری قوم!

تم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہو! کیا تم ڈرتے نہیں؟"

اسی سورہ کی آیت (۷۳) میں پھر وہی بات دہرائی گئی ہے:

"ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ انہوں نے کہا، اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں"۔

اس سے قبل اسی سورہ کی آیت (۵۹) میں بھی یہی بات جناب نوحؑ کے بارے میں کہی۔ فرمایا کہ:

"ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو انہوں نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی بھی تمہارا معبود ہونے کے قابل نہیں"۔

(۵) سورہ طٰہٰ (۲۰) کی آیت (۱۴) میں فرمایا گیا کہ:

"بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں"۔

(۶) سورہ الزخرف (۴۳) کی آیت (۸۴) میں فرمایا:

"وہی ہے آسمانوں میں معبود اور زمین پر بھی، (اور) وہی قابل عبادت ہے، اور وہ ہے تمام تر حکمت والا اور سب کچھ جاننے والا"۔

(۷) سورہ المومن (۴۰) کی آیت (۶۲) میں فرمایا کہ:

"یہی ہے اللہ، تم سب کا رب، ہر شے کا خالق، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ تو پھر کہاں بھٹکے جاتے ہو؟"۔

پھر اسی سورۃ (۴۰) کی آیت (۶۵) میں فرمایا گیا کہ:

"وہ زندہ ہے، جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں، پس تم خالص اسی کی عبادت کرتے ہوئے اسے پکارو"۔

(۸) سورہ محمد (۴۷) آیت (۱۹) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا کہ:

"تو (اے نبی)! یقین کرو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگا کرو، اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی"۔

(۹) سورہ الطور (۵۲) آیت (۴۳) میں فرمایا:

"کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی اور معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) اللہ ان کے شرک سے پاک ہے"۔

(۱۰) سورہ الحشر (۵۹) آیت (۲۲) اور (۲۳) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب اور ظاہر کا جاننے والا، نہایت مہربان اور رحم کرنے والا"۔ (۲۲)

"وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، (جو ہے) بادشاہ بالکل پاک، تمام عیوب سے ممتاز، امن دینے والا، نگہبان، غلبہ پانے والا، زور آور، اور بڑائی والا، پاک ہے اللہ ان سب سے، جنھیں یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں"۔ (۲۳)

(۱۱) سورہ القصص (۲۸) کی آیت (۷۰) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"وہی ہے اللہ، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، دنیا اور آخرت میں اُسی کی تعریف ہے۔ اُسی کے لیے فرمانروائی ہے، اور اُسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے"۔

(11) توحید خالقیت

خلق کرنے کا مطلب ہے کسی بھی چیز کو بغیر کسی نمونے کے پہلی بار پیدا کرنا۔ اور پھر اس کے مقررہ مدت تک زندہ رہنے کے لیے اصول اور قوانین مرتب کرنا۔ مثلاً اسے سوچنے اور سمجھنے کے لیے اور کاروبارِ زندگی کو متحرک رکھنے کے لیے ذہن عطا کرنا اور ایسے حواس عطا کرنا جن کی مدد سے وہ جان سکے، یعنی مشاہدہ کر سکے۔ جیسے حیوانات کو اللہ تعالیٰ نے حواسِ خمسہ عطا کیے ہیں۔

خلق کرنے کی یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور میں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ وہ اس معاملہ میں یکتا ہے۔ وہی زندگی دیتا ہے اور موت بھی اور وہی بعد از موت پھر زندگی دے گا۔ جب اللہ تعالیٰ اپنی کسی مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے تو پھر اپنی اس مخلوق میں اس کی تولید اور افزائشِ نسل کے لیے بھی کامل اصول اور طریقے وضع کر دیتا ہے اور پھر ان قواعد کے مطابق ان کی نسل بڑھتی رہتی ہے۔

قرآن الحکیم میں اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بیشتر آیات نازل فرمائی ہیں۔ یہاں چند چیدہ چیدہ آیاتِ مبارکہ کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

(۱) سورہ النساء (۴) کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا (یعنی آدم سے) اور اُسی سے اس کی زوجہ کو پیدا کر کے، ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں"۔

(۲) سورہ الانعام (۶) آیت (۱۔۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"تمام تعریفیں (حمد) اللہ تعالیٰ ہی کے لائق ہیں۔ جس نے پیدا کیا زمین اور آسمانوں کو، اندھیرے اور روشنی کو بنایا (لیکن) پھر بھی کفر کرنے والے (ماسوا اللہ کو) اپنے رب کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں"۔

"وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمھیں مٹی سے بنایا، پھر ایک وقت معین کیا (موت کے لیے) اور وقت معین خاص اللہ ہی کے نزدیک ہے (یعنی صرف اللہ ہی کو معلوم ہے)، اور پھر بھی تم شک رکھتے ہو"۔

سورہ (۱) اور دیگر جہاں جہاں قرآن الحکیم میں لفظ حمد آیا ہے اس کا مطلب ہے ایسی تعریف جو صرف اور صرف اپنے رب اور خالق کے لیے ہی سزاوار ہو۔ کسی اور کے لیے نہیں۔ حمد کے لیے کسی بھی نعمت یا رحمت کو مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ حمد اس کے لیے ہوتی ہے جس کی شان اور عظمت جلال و اکرام یکتا ہو۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات مبارکہ ہے۔ حمد کے علاوہ اللہ تعالیٰ جو نعمتیں ہمیں عطا کرتا ہے اور رحمتیں نازل فرماتا ہے اس کے واسطے اس کا شکر ادا کیا جاتا ہے۔ حمد صرف اللہ کے لیے جبکہ شکر اس کے بندوں کا بھی کیا جاتا ہے، جو احسان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب کسی کی تعریف کرنی مقصود ہو اللہ تعالیٰ کے علاوہ تو اسے مدح کہا جاتا ہے۔

(۳) سورۃ الحجر (۱۵) (۲۶۔۲۷) فرمایا گیا:

"یقیناً ہم نے انسان کو کالی اور سڑی ہوئی کھنکھناتی مٹی سے پیدا فرمایا"۔ (۲۶)

"اس سے پہلے ہم نے جنات کو شعلے والی آگ سے پیدا کیا"۔ (۲۷)

جنات ایسی مخلوق کو کہتے ہیں جو انسانوں کو نظر نہیں آتی اور نظر آنے پر انسان اس سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ لفظ 'جن' کا مطلب ہے نظر نہ آنے والے اور خوف۔ جنات بھی انبیاء

کی شریعت کے پابند ہوتے ہیں اور نہ ہونے والے کافر۔

(۴) سورۃ النحل (۱۶) آیات (۳ تا ۵) فرمایا:

"اُسی نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا (اور) وہ اس سے بُری ہے جو مشرک اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں"۔(۳)

"پیدا کیا انسان کو نطفے سے (اللہ نے) پھر وہ صریح جھگڑالو بن گیا"۔(۴)

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو معمولی اور حقیر شے سے پیدا کیا جس کی کوئی ہستی ہی نہ تھی اور پھر وہ اس ہستی سے بے ہستی ہو جائے گا، یعنی مرنے کے بعد ایک مردہ لاش اور اس حالت میں جبکہ وہ گندگی سے اٹا پڑا ہوتا ہے، وہ غرور اور تکبر کرتا ہے اور اپنی برتری کی خاطر جھگڑے کرتا ہے۔ حالانکہ اسے اللہ تعالیٰ کا تابعدار اور شکرگزار بندہ بن کے عاجزی کے ساتھ رہنا چاہیے۔

"اُسی نے پیدا کیے چوپائے، جن میں تمہارے لیے سردی کے لباس ہیں (اس کے علاوہ) اور بھی نفعے ہیں اور بعض تمہارے کھانے کے کام آتے ہیں"۔(۵)

(۵) سورۃ الانبیاء (۲۱) آیات (۳۰۔۳۱۔۳۳) فرمایا گیا:

"کیا وہ جو کفر کرتے ہیں، نہیں جانتے کہ آسمان اور زمین اکٹھے تھے اور پھر ہم نے انہیں علیحدہ علیحدہ کر دیا؟ اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے پیدا کیا۔ کیا یہ لوگ (کافر) پھر بھی ایمان نہیں لاتے"۔(۳۰)

اس آیت کریمہ سے ہمیں یہ گمان نہ گزرے کہ انسان کو تو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے تو پھر یہاں پانی سے پیدا کرنا کیوں کہا جا رہا ہے۔ تو اس بات کے لیے یہ واضح ہو کہ تمام جمادات تو پانی سے ہی پیدا کیے گئے ہیں۔ اور دیگر مخلوقات اور انسان مٹی کے گارے سے پیدا کیے گئے ہیں۔ گارے میں مٹی اور پانی کا ملاپ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر نوعی روح کے لیے مٹی اس کی بنیاد رکھی گئی ہے، جبکہ پانی اسے سہارا دیتا ہے اور ہوا میں سے آکسیجن اس کی روح کو قائم رکھتی ہے۔

آیت (۳۱): "اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنا دیے تاکہ وہ (اس پر رہنے والی) مخلوق کو ہلا نہ سکے اور ہم نے اس میں کشادہ راہیں بنا دیں تاکہ وہ راستہ حاصل کریں"۔

"وہی ہے اللہ جس نے رات اور دن، سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار (دائرے) میں تیرتے پھرتے ہیں (گردش کرتے ہیں)"۔(۳۳)

(۶) سورۃ الحج (۲۲) آیت (۵) میں فرمایا:

"لوگو! اگر تمہیں مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو سوچو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون بستہ سے (یعنی خون کی چھنک سے) پھر گوشت کے لوتھڑے سے جو بے نقش تھا، پھر اسے صورت دی گئی۔ یہ ہم تم پر ظاہر کر دیتے ہیں اور ہم جسے چاہیں ایک مقرر وقت تک رحم مادر میں رکھتے ہیں۔ پھر تمہیں بچپن کی حالت میں دنیا میں لاتے ہیں تاکہ تم جوانی کو پہنچو، تم میں سے بعض تو وہ ہیں جو (جوان ہونے سے پہلے ہی) فوت کر لیے جاتے ہیں اور بعض بے غرض عمر (بڑھاپے) کی طرف پھیر سے لوٹا دیے جاتے ہیں کہ وہ ایک چیز سے باخبر ہونے کے بعد پھر بے خبر ہو جائیں۔ تم دیکھتے ہو کہ زمین (بنجر اور) خشک ہے، پھر جب ہم اس پر بارشیں برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم کی بارونق نباتات اُگاتی ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ باور کیا ہے کہ وہ کیوں کر مرنے کے بعد زندہ ہونے پر یقین رکھے۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ تخلیقِ انسانی کو بیان فرمایا ہے۔ تاکہ کافروں پر یہ واضح ہو جائے کہ جو اللہ نہ ہونے سے انسان کو ہونے تک لاتا ہے تو وہ پھر کیوں کر دوبارہ اُسے پھر سے زندگی عطا نہ کر سکے گا۔ اگر انسان دوبارہ زندہ ہونے پر یقین نہیں کرے گا تو وہ روزِ قیامت اور سزا اور جزا پر بھی یقین نہ لائے گا۔ اور اس طرح سے وہ ایک بے مقصد زندگی گزار کر مقصدِ زندگی کو فراموش کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ وہ انسان کو قیامت کے بعد آگ میں جلنے کی سزا دے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح سے انسان کو سمجھایا ہے کہ وہ آخرت کی زندگی، روزِ قیامت اور روزِ جزا پر یقین رکھے۔ تاکہ وہ اس دنیا کی زندگی کو اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق گزارے اور آخرت میں ایک خوفناک سزا سے بچ جائے اور اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا حق دار ٹھہر جائے۔

(۷) سورۃ المومنین (۲۳) آیات (۱۲۔۱۳۔۱۴) میں فرمانِ ربی ہے:

"یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا"۔(۲)

یعنی مٹی کے خاص اجزا اور پانی جسے ہر نباتات زمین سے جذب کرتی ہیں، پھر اُسے ہر انسان اور جاندار کھلے اور پھلوں، سبزیوں کی صورت میں کھاتے ہیں۔ اس سے ان کا جسم پرورش پاتا ہے، جانور دودھ دیتے ہیں اور ان کا گوشت پوست بنتا ہے جسے انسان استعمال کرتے ہیں۔یعنی مٹی اپنی حالت تبدیل کر کے جانداروں کے لیے خوراک بن جاتی ہے اور جب یہی جاندار فوت ہو جاتے ہیں تو ان کا جسم پھر مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔

"پھر اسے نطفہ بنا کر محفوظ جگہ میں قرار دیا"۔(۱۳)

"پھر نطفہ کو ہم نے جما ہوا خون بنا دیا۔ پھر اس خون کے لوتھڑے سے گوشت بنا دیا، پھر گوشت کے ٹکڑے کو ہڈیاں بنا دیا اور پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا اور پھر اسے دوسری بناوٹ میں پیدا کر دیا (یعنی اس کو شکل وصورت دی) برکتوں والا ہے وہ اللہ، جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے"۔(۱۴)

(۸) سورۃ الفرقان (۲۵) آیت (۵۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اسے خونی رشتوں والا اور شادی کے رشتوں والا بنایا۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار (ہر شے پر) قادر ہے"۔

(۹) سورۃ الروم (۳۰) آیت (۲۰) میں فرمایا گیا:

"اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر اب انسان بن کر چل پھر رہے ہو"۔

مطلب یہ کہ تمہیں ایک حقیر شے سے پیدا کیا ایک بچے کی صورت، پھر تم پرورش پا کر بڑے ہو جاتے ہو اور کسب معاش کے سلسلے میں دنیا میں پھیل جاتے ہو۔

(۱۰) سورۃ السجدہ (۳۲) آیت (۷ تا ۹)۔

"جس نے نہایت خوب بنائی، جو چیز بھی بنائی۔ اور انسان کی بناوٹ مٹی سے شروع کی"۔

خوب بنائی کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جو کچھ بھی بنایا اعلیٰ وعمدہ بنایا، اپنے فن کے اعتبار سے لاجواب اور باکمال بنایا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کا حسن دیکھیں، ان کی پرکشش بناوٹ،

دلکش خوبصورتی، سریلی اور دل لبا آوازیں، ان کی پیاری پیاری ادائیں، ان کی عجیب وغریب خصوصیات۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر انسان بے اختیار پکار اٹھتا ہے" سبحان اللہ" جب مخلوق ایسی دل لبھانے والی کمالات سے بھرپور تو اس کے خالق کی شان کیسی اعلیٰ وعمدہ ہوگی۔

"پھر اس کی نسل پانی کے نچوڑ سے بنائی"۔

عجیب راز اور کمالات ہیں اللہ تعالیٰ کے تخلیق کرنے کے۔ انسان اور دیگر جانداروں کا نطفہ یا بیج اتنا چھوٹا اور حقیر ہوتا ہے کہ خوردبین کے بغیر نظر نہیں آسکتا۔ انسان کھلی آنکھ سے اس کا ملاحظہ نہیں کرسکتا۔ لیکن اس ذرہ برابر نطفہ میں ایک مکمل انسان یا جانور موجود ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق پرورش پا کر انسان یا جانور کے بچے کی صورت میں دنیا میں آجاتا ہے۔ اسی طرح سے درخت کے بیج میں ایک مکمل درخت پوشیدہ ہوتا ہے، یہی اللہ تعالیٰ کی شان خلاقیت ہے۔

"جسے ٹھیک ٹھاک کر کے اس میں اپنی روح پھونکی، اسی نے تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے (اور اس پر بھی) تم بہت تھوڑا احسان مانتے ہو (اپنے خالق کا)"۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس ذرہ برابر نظر نہ آنے والی شے کی اس طرح سے پرورش کی کہ وہ ایک مکمل انسانی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس میں روح بھی داخل کر دی گئی، اسے سوچ سمجھ کی صلاحیت بھی عطا ہوگئی، اسے زندہ رہنے کے لیے علم جبلی بھی عطا کیا گیا۔ اس میں سننے کی صلاحیت، بولنے کی صلاحیت، دیکھنے کی صلاحیت، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت، اچھائی اور برائی کو جانچنے کی صلاحیت، اور ایک طاقتور جسم عطا کیا۔ ان کے علاوہ دیگر بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں۔ اس لیے انسان کے لیے یہ لازم ہوگیا کہ وہ اپنے خالق کی ان گنت نعمتوں کے عوض اس کا شکر ادا کرتے رہیں۔ اس کی بڑائی کی وجہ سے اس کی حمد بیان کرتے رہیں اور اس کی تابعداری میں اپنی زندگی بسر کریں۔

(۱۱) سورۃ یٰسٓ (۳۶) آیت (۷۷۔۷۸) میں فرمایا کہ:

"کیا انسان کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا؟ پھر یکایک وہ صریح جھگڑالو بن گیا"۔

"اور اس نے ہمارے لیے مثال بیان کی اور اپنی (اصل) پیدائش کو بھول گیا (اور) کہنے لگا ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں کو یاد دلایا جو اس کی نافرمانی کرتے ہیں، ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں اور زمین پر فساد برپا کرتے ہیں کہ انہیں اپنی اصل کیوں یاد نہ رہی اور وہ کس وجہ سے غرور کرتے ہیں؟ جبکہ وہ اصل میں کچھ نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں وجود میں لائے اور اللہ ہی انہیں فوت کرے گا۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے غرور اور تکبر کا اظہار فرمایا ہے۔

امام غزالیؒ نے ایسے ہی متکبر لوگوں کو سامنے رکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ انسان کو کسی قسم کا فخر یا تکبر یا غرور زیب نہیں دیتا۔ اس کے لیے اگر وہ اپنے ماضی، حال اور مستقبل پر نظر ڈال لے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ اس لائق نہیں ہے کہ تکبر یا غرور کا مرتکب ہو سکے۔ انسان کو یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ وہ ماضی میں کچھ نہ تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ اُسے وجود میں لایا ایک نطفہ کی حالت میں، ایسی حالت جو نہایت حقیر اور ناقابل بیان ہوتی ہے۔ اور کوئی انسان ایسی حالت پر کبھی فخر نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد اس کا حال جس میں اس کا جسم غلاظت سے بھرپور، اس کا خون جو پیپ کے ساتھ اس کے تمام جسم میں گردش کرتا ہے۔ اس کی خاصیت یہ کہ جب وہ اعلیٰ قسم کے خوشبودار رنگ برنگے شیریں میوہ جات نوش جان کرتا ہے تو وہ مل سڑ کر بدبودار غلاظت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کیا وہ اپنی اس خاصیت پر فخر کرنا پسند کرے گا؟ کبھی نہیں بلکہ وہ اس بات کو سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی یہ غرور آمیز، اکڑی ہوئی گردن اور خوفناک آواز کے ساتھ زندہ رہنا پسند کرتا ہے۔ حالانکہ اس کا حال کسی صورت بھی قابل فخر نہیں۔

اب رہا اس کا مستقبل، جہاں وہ نا تو اس جسم، جھکی کمر اور کمزور بینائی کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ کھانا اس کے لیے محال اور سننا بھی اس کے لیے معدوم، اس حالت میں اس کی روح بھی پرواز کر جاتی ہے اور وہ بے حس، بے جان لاشے کی شکل میں رہ جاتا ہے۔ کیا یہ سب حالتیں قابل فخر ہوتی ہیں؟

لہٰذا انسان کا ماضی، حال اور مستقبل سب باعث شرمندگی ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ

اپنی حالت پر غرور کرنا پسند کرتا ہے۔ اس حالت میں اگر وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کر کے اپنی روح کو پاکیزہ کرے اور اپنی زندگی عاجزی اور انکساری کے ساتھ بسر کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول و ممتاز ہو جائے گا۔

دوسری بات جو آیت (۷۸) میں کہی گئی کہ بے وقوف لوگ حیرانی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ گلی سڑی ہڈیاں جو انسان کی موت کے بعد باقی رہ جاتی ہیں، کیا ہمیں ان سے دوبارہ پیدا کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ جو لوگ اپنے مُردوں کو جلا کر ان کی راکھ پانی میں بہا دیتے ہیں وہ بھی حیرت سے یہ کہتے ہیں کہ ان کے وجود کو ضائع کر دیا جاتا ہے اب وہ دوبارہ کیسے پیدا کیے جائیں گے۔ لیکن وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ جس خالق نے انہیں اس وقت پیدا کیا جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھے تو کیا وہ دوبارہ پھر ان لوگوں کو پیدا نہیں کر سکتا؟

بے شک اللہ تعالیٰ بڑی شان والا ہے، تمام کائنات کا مالک اور تمام جاندار، نباتات اور حیوانات سب کا پیدا کرنے والا ہے، بغیر کسی نمونے کے۔ تو دوبارہ پھر سے انہیں پیدا جیسے چاہے کیوں کر زندہ نہیں کر سکتا؟

(۲) سورۃ الدھر (۷۶) آیت (۱-۲) میں فرمایا کہ:

"یقیناً انسان پر گزرا ہے ایک وقت زمانے میں (دنیا میں) جبکہ یہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا"۔

"بے شک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا، امتحان کے لیے، اور اسے سنتا دیکھتا بنایا"۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی اصل اوقات بتائی ہے۔ جبکہ وہ اس حال میں تھا کہ پہچان کے قابل ہی نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ قابل ذکر تھا۔ لیکن جب وہ پیدا ہوا اور اپنی جوانی پر پہنچا تو پھر لگا غرور کرنے اپنے حسن پر، اپنی طاقت پر، اپنی دانش پر، اپنی دولت پر۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی پیدائش کا مقصد فقط یہ رکھا کہ اس کی آزمائش کی جائے کہ کیا وہ اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے حکم اور فرمانبرداری کے ساتھ بسر کرتا ہے یا نہیں۔ تاکہ آخرت میں وہ اس کے انعام کا حق دار ہو جائے۔ بصورت دیگر نافرمانوں کے لیے جہنم تیار رکھی گئی ہے۔

(۱۳) سورۃ الاعراف (۷) آیت (۵۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے، جس نے تمام آسمانوں کو اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا (اور) پھر عرش پر قائم ہوا۔ وہ رات سے دن کو ایسے چھپا دیتا ہے کہ وہ رات اس دن کو جلدی سے آلیتی ہے اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا، ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ یاد رکھو اللہ ہی کے لیے ہے خاص، خالق ہونا اور حاکم ہونا۔ بڑی خوبیوں سے بھرپور ہے اللہ جو تمام عالم کا پروردگار ہے"۔

اس آیت کریمہ کی تشریح کی ضرورت نہیں، یہاں ہر طرح سے واضح کر دیا گیا ہے کہ ہر شے کا پیدا کرنے والا، پالنے والا اور قائم رکھنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہی پوری کائنات کے نظام کو چلانے والا ہے۔

(۱۴) سورۃ یونس (۱۰) آیت (۳-۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہی ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا۔ وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے پاس سفارش کرنے والا نہیں، ایسا اللہ تمہارا رب ہے، سو تم اس کی عبادت کرو، کیا تم پھر بھی نصیحت نہیں پکڑتے"۔

"تب سب کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے، اللہ نے سچا وعدہ کر رکھا ہے۔ بے شک وہ پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے، پھر وہی دوبارہ بھی پیدا کرے گا تاکہ ایسے لوگوں کو جو کہ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے، انصاف کے ساتھ جزا دے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے واسطے کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا اور دردناک عذاب ہوگا، ان کے کفر کی وجہ سے"۔

(۱۵) سورہ المومن (۴۰) آیت (۶۲) فرمایا گیا:

"یہی اللہ ہے، تم سب کا رب، ہر شے کا خالق، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر تم کہاں پھرے جاتے ہو"۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ مبارکہ میں بار بار کر لیا ہے وہ لوگ جو دنیا اور آسمانوں کے عجائبات خلا، بارش، بجلی کی کڑک، آندھی، طوفان وغیرہ اور طرح طرح کی مخلوقات کی پیدائش دیکھتے ہیں تو وہ اس بات کو کیوں کر نہیں سمجھتے کہ ان سب مخلوقات اور عجائبات کا کوئی نہ کوئی تو پیدا کرنے والا ہوگا، ان کو قائم رکھنے والا اور ان کو فنا کرنے والا تو کوئی ہوگا۔ حالانکہ ان کے لیے ان کی

اپنی تخلیق اور رات دن کا آنا، جانا ہی اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔

(۱۶) سورۃ الشوریٰ (۴۲) آیت (۱۱) میں بتایا گیا ہے کہ:

"وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس کے جوڑے بنا دیے ہیں، اور چوپاؤں کے بھی جوڑے بنائے، اور تمہیں وہ اس (زمین) میں پھیلا رہا ہے۔ اس (اللہ) جیسی کوئی چیز نہیں، (اور) وہ سننے اور دیکھنے والا ہے"۔

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ وہ ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے۔ لہٰذا ان سب کا مالک بھی ہے اور یہ کہ اس نے اپنی مخلوق کی افزائش نسل کا بھی پورا پورا اہتمام کیا ہے۔ کیا عقل مندوں کے لیے یہ کافی ثبوت نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اس کائنات اور اس کی مخلوق کا اکیلا مالک مان کر اس کی تابعداری اور فرماں برداری کریں۔

(۱۷) سورۃ الحشر (۵۹) آیت (۲۴) میں فرمایا:

"وہی ہے پیدا کرنے والا، وجود بخشنے والا، صورت بنانے والا، (اور) اُسی کے لیے ہیں (نہایت) اچھے نام۔ ہر شے خواہ وہ آسمانوں میں ہو یا زمین پر، اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور وہی ہے غالب اور حکمت والا"۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے پہلے کی طرح انسان کو دلیل کے ذریعہ یاد دہانی کرائی، بلکہ سمجھایا ہے کہ وہ انسان اور دیگر مخلوقات کی پیدائش کے عجائبات پر غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سے نہ ہونے سے اپنی مخلوقات کو ظہور پذیر کیا ہے۔ نباتات ایک چھوٹے سے بیج سے اور حیوانات ایک ذرہ برابر نطفے سے کس طرح سے درختوں اور حیوانات کو پروان چڑھاتا ہے اور اس سے ایک خوبصورت جسم، حسین اور جمیل عقل و دانش کا پیکر جبکہ نباتات میں کیسے خوشبودار، رسیلے اور رنگین میوے پیدا کرتا ہے۔ ان دونوں کے مقابلے میں انسان کو تمام حیوانات اور نباتات و جمادات سے فضیلت عطا فرمائی اور اپنی نیابت کے درجے پر فائز کیا اور اس کو علم اور عقل سے سرفراز کیا جس سے اس نے دوسری تمام مخلوقات کو اپنے تابع کر لیا۔

یہاں ایک بات نہایت قابل غور ہے کہ انسان کے علاوہ تمام کی تمام مخلوق خواہ مادی جمادات ہوں، نباتات، کیڑے مکوڑے یا پرند و چرند یا خونخوار درندے، وہ سب کے سب

اپنے رب کی حمد وثناء بیان کرتے ہیں، اپنے وقت مقررہ پر۔ تو پھر یہ انسان جب اپنی عقل استعمال نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو نظر انداز کر دیتا ہے تو پھر وہ اس بات سے بے نیاز ہو جاتا ہے کہ اس کا ایک مالک بھی ہے جس کی بندگی اور تابعداری اس کا فرض ہے۔ یہاں اس درجے پر وہ ان حقیر جانوروں سے اور نباتاتی اور جماداتی مخلوق سے بھی کمتر ہو کر اپنے مالک کی نظروں میں گر جاتا ہے اور اس طرح سے وہ مقامِ نیابت اور مقامِ خلافت کا اہل نہیں رہتا اور مجرموں کی صف میں آ کھڑا ہوتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر احسانِ عظیم یہ کیا کہ اپنے پیغمبروں کے ذریعے ان تک پیغامِ ہدایت بھی پہنچایا تا کہ وہ ہدایت ربّی سے سرفراز ہو کر اس کے نیک بندے بن جائیں۔ لیکن بدبخت ہیں وہ لوگ جو اس نعمت سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور ابلیس کے راستے پر چل کر دیسے ہی نافرمان بن جاتے ہیں۔

(iii) توحیدِ رُبُوبِیّت

اس بات پر ایمان رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک واحد ہستی ہے جو ہر موجودات، یعنی ہر ظاہر و باطن مخلوقات کا رب ہے۔ رب کا مطلب ہے مالکِ کُل یعنی اس کی ملکیت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے اور نہ ہی کوئی مددگار۔ اس اکیلے نے اپنی تمام مخلوق کو پیدا کیا اور کرتا ہے اور کرے گا اور وہی اس کا مالکِ کُل بھی ہے۔ اور وہی تمام موجودات کو طے شدہ اصولوں اور قوانین کے مطابق چلا رہا ہے۔ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ صرف مالک ہی نہیں بلکہ اپنی مخلوق کی تخلیق کے بعد اس کی مکمل نشوونما بھی کرتا ہے۔ اس نشوونما کو عام لفظوں میں پالنا بھی کہا جاتا ہے اور یہی صفتِ ربوبیت ہے۔ چونکہ وہ مالک بھی ہے اور اس کی نشوونما بھی کرتا ہے، اپنی مخلوق کو اس کے اعلیٰ درجے تک پہنچاتا ہے اس لیے اس کی حفاظت بھی کرتا ہے، اپنے وضع کردہ اصولوں کے مطابق۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن الحکیم میں جا بجا ذکر فرمایا ہے، لیکن یہاں چیدہ چیدہ آیاتِ مبارکہ کا ذکر کیا جائے گا۔

(۱) سورۃ فاتحہ (۱) کی آیت (۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے"۔

بتایا گیا ہے کہ ہر قسم کی تعریف صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکت کو ہی جچتی ہیں۔ کیونکہ صرف اُسی کی ذاتِ پاک ہی اس کی اہل ہے۔ جب ہم کسی خوبصورت مخلوق کی تعریف کر رہے ہوتے ہیں یعنی کسی انسان کی، یا کسی پرندے یا جانور کی یا کسی پھول یا پودے کی، کسی پھل کی یا کسی منظر کی تو دراصل وہ تعریف اللہ تعالیٰ کی ہی ہوتی ہے جس نے وہ حسین تخلیق کی ہوتی ہے۔ اس لیے جب اللہ کے تابعدار بندے جب کسی دلکش، حسین یا کسی نادر مخلوق کو دیکھتے ہیں جو اس کا دل موہ لیتی ہے تو اس کی زبان سے خود بخود اللہ تعالیٰ کی تعریف کے کلمات نکل آتے ہیں اور وہ "سبحان اللہ" پکار اٹھتا ہے۔ یعنی وہ تعریف کرتا ہے اس پاک ذات کی جس نے وہ حسین تخلیق کی ہوتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو تمام جہانوں کا پالنے والا کہا ہے۔ یعنی اس نے اپنی صفت اور شانِ ربوبیت کا ذکر کیا، جس کا بیان مضمون کے شروع میں ہو چکا ہے۔

(۲) سورہ المائدہ (۵) آیت (۷۲) میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا ذکر فرمایا ہے اور بڑی شدت کے ساتھ بتایا ہے کہ اس کی ذاتِ باکمال و بابرکت کے کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اور جو لوگ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں ان کے لیے بڑی وعید سنائی ہے۔ سورۃ شریفہ میں بتایا گیا ہے کہ:

"بے شک وہ لوگ کافر ہو گئے جن کا قول ہے کہ مسیح ابنِ مریم ہی اللہ ہے، حالانکہ خود مسیح نے کہہ دیا تھا: اے بنی اسرائیل اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا اور تم سب کا رب ہے (اور) یقین کرو کہ جو شخص اللہ کے ساتھ (کسی کو بھی) شریک کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے (اور) اس کا ٹھکانا جہنم ہی ہے۔ اور گناہگاروں کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا"۔

یاد رہے کہ جناب مسیحؑ کی پیدائش جب بغیر باپ کے ہوئی تو بستی کے لوگ ان تک پہنچے اور ان کی والدہ مریم کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اور کہا کہ انہوں نے کیوں کر ایسا کام کیا جو شرمندگی کا باعث بنا۔ اس الزام کے جواب میں مریم نے اپنی گود میں لیٹے نوزائیدہ مسیحؑ کی طرف اشارا کیا، جس کا مطلب تھا کہ اس سے پوچھو۔ اس پر لوگوں نے بڑی حیرانگی کے ساتھ کہا کہ بہت خوب! اب یہ بچہ بھلا ہمیں کیا جواب دے گا۔ ان کی اس بات پر اللہ تعالیٰ

نے اپنے خاص بندے جناب مسیحؑ کو گویائی عطا کی اور ساتھ ہی نبوت بھی، اور الہامی کتاب کے آنے کا اعلان بھی کر دیا۔ پھر جناب مسیحؑ نے اپنی ماں کی گود میں ہی لوگوں کو مخاطب کیا اور اعلان کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اور ان لوگوں کے لیے نبی بن کر آئے ہیں اور ایک کتاب بھی جو ان پر نازل ہوگی اللہ کی طرف سے۔

اس کھلی نشانی کے باوجود تعجب کی بات ہے کہ لوگوں نے اس آگاہی کو جھٹلا دیا اور جناب مسیحؑ کو اللہ کا بیٹا کہنے لگے۔ اور اس طرح سے انہوں نے توحیدِ ربوبیت کی نفی کر دی، اور اپنی بدبختی کو دعوت دی۔

اسی طرح سے وہاں یہود کے ایک گروہ نے جناب عزیرؑ جو اللہ کے پیغمبر تھے انہیں اللہ کا بیٹا قرار دیا اور توحیدِ ربوبیت کی نفی کی۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس کی ذات و صفات کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے۔

(۳) سورۃ الاعراف (۷) آیت (۲۳) میں فرمایا گیا ہے کہ جب کسی انسان سے اللہ تعالیٰ کے احکامات سے انحراف ہو جائے یعنی کوئی غلطی ہو جائے تو اُسے فوری طور پر معافی مانگ کر اللہ تعالیٰ کو راضی کر لینا چاہیے۔ اور آئندہ کے لیے ایسی غلطی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اس آیت شریفہ میں معافی کا جو درس دیا جا رہا ہے رب العالمین کی طرف سے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

جب آدمؑ اور حواؑ سے جنت میں رہائش کے دوران وہ کام سرزد ہو گیا جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں منع کیا تھا، اور یہ نافرمانی ابلیس کے نہایت خطرناک مکر اور دشمنی کی وجہ سے ہوئی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ جس پر ہمارے دونوں جد امجد اپنی غلطی پر نہایت نادم اور شرمسار ہو گئے اور ساتھ ہی پریشانی کے عالم میں یہ سوچنے لگے کہ وہ کس طرح سے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگیں اور اُس کے غیظ و غضب سے بچ جائیں۔ اس طرح سے ان پر شرمندگی کے ساتھ خوف بھی طاری ہو گیا۔ لیکن ان کو زبان سے معافی مانگنے کا طریقہ اور الفاظ نہیں آتے تھے۔

اللہ تعالیٰ جو دلوں کے حال سے واقف ہیں، انہوں نے آدمؑ و حواؑ کے خوف اور ندامت کے آثار دیکھ لیے اور پھر انہیں الہام کے ذریعے معافی کے الفاظ ان کے قلب پر اُتارے، تاکہ وہ ان الفاظ کے ساتھ اللہ سے معافی مانگیں۔

چونکہ حضرت انسان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پہلا الہام تھا چنانچہ وہی الفاظ اللہ تعالیٰ نے عالی جناب محمد ﷺ پر بھی الہام کر دیے، تاکہ آپ ﷺ کی امت کے لوگ بھی اپنے آباء کی طرح ان الفاظ کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے معافی کے طلب گار ہو سکیں۔

یہ الفاظ متذکرہ بالا سورۃ الاعراف (۷) کی آیت (۲۳) میں نازل ہوئے جن کا ترجمہ ہے:

"دونوں نے کہا، اے ہمارے رب! ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا (آپ کی نافرمانی کر کے) اگر آپ ہماری مغفرت نہ فرمائیں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے"۔

اس سلسلے میں ایک خاص بات ذہن نشین کر لینی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جناب آدمؑ و حواؑ کی معافی تو قبول کر لی، لیکن یہ معافی مشروط تھی چند شرائط کے ساتھ۔ وہ یہ کہ یہ دونوں اپنے مقام سے یعنی جنت سے زمین پر منتقل کر دیے جائیں گے۔ وہاں انہیں اور ان کی تمام اولاد کو ایک وقت مقررہ تک آزمائش میں رکھا جائے گا۔ پھر ان میں سے جو لوگ بھی آزمائش میں پورے اتریں گے تو وہ واپس اپنے آباء کے گھر میں واپس آ جائیں گے، یعنی جنت میں۔ بصورت دیگر نافرمان لوگ وہاں جانے کے حقدار نہ ٹھہریں گے، بلکہ شدید عذاب میں مبتلا کر دیے جائیں گے یعنی جہنم رسید کر دیے جائیں گے۔

(۴) سورۃ الاعراف (۷) آیت (۱۷۲) فرمایا گیا:

"اور جب تمہارے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا، اور ان سے ہی ان کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا، کیوں نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں۔ تاکہ تم لوگ روزِ قیامت یوں نہ کہو کہ ہم تو محض بے خبر تھے"۔

یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کے متعلق بہت بڑی گواہی دیتی ہے۔ جس کی تفصیل کا بیان نہایت ضروری ہے:

اللہ تعالیٰ کا اولادِ آدم سے اپنی ربوبیت کے بارے میں گواہی لینا اس طرح سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن تمام ارواح کو اپنے حضور حاضر کیا جو آدم سے تا قیامت پیدا ہونا تھیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح سے پیدا کیا کہ جو وعدہ ان کی ارواح نے کیا تھا وہ ان کی فطرت میں رکھ دیا۔ لہٰذا ہر انسان فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت یعنی اللہ کو رب مانتا ہے۔ رب کا مطلب جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے پیدا کرنے والا، پرورش کرنے والا مالک۔

اِسی بات کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الروم (۳۰) آیت (۳۰) میں فرمایا ہے کہ:

''پس اپنے آپ کو متوجہ کرو (اے محمدؐ) دینِ حنیف کی طرف، جس پر اس (اللہ) نے انسانوں کو پیدا کیا۔ اللہ کے اس فطری دین کو تبدیل نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے''۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے کہ ان کی تربیت کرو کہ وہ اپنی فطرت کے مطابق دینِ حق کو قبول کر لیں، اور اللہ تعالیٰ اپنی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل نہیں کرتا۔

اسی سلسلے میں جناب نبی کریم ﷺ کا فرمان مبارک ہے جو بخاری و مسلم میں منقول ہے۔ فرمایا کہ: ''ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا زرتشت بنا دیتے ہیں۔ جیسا کہ جانور اپنے پورے جسم کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ کیا تم نے دیکھا کسی جانور کو کٹے ہوئے ناک یا کان کے ساتھ، ان کی پیدائش کے بعد''۔

ایک دوسری حدیث کے مطابق مروی ہے عیاض بن حمار سے کہ فرمایا جناب رسول کریم ﷺ نے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: میں نے پیدا کیا اپنے بندوں کو یکتا، لیکن شیاطین ان کے پاس آئے اور انہیں ان کے دین سے پھیر دیا جس پر میں نے ان کو رکھا تھا''۔

(۵) سورۃ یونس (۱۰) آیات (۳۱) اور (۳۴) میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت اور حاکمیت کے متعلق مزید تفصیل سے بیان فرمایا ہے:

''کہو (اے محمدؐ)! وہ کون ہے جو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے؟ یا وہ کون ہے جو

کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ ضرور وہ (کافر) یہی کہیں گے کہ اللہ۔ تو ان سے کہو کہ پھر (وہ) کیوں نہیں ڈرتے (اللہ سے)''۔ (۳۱)

آسمان اور زمین سے رزق عطا ہونے کا مطلب ایک تو وہ ہے جو آسمان سے بنی یہود کے لیے اُتارا گیا تھا، یعنی من و سلویٰ اور دوسرا مطلب ہے کہ جب آسمان سے بارش ہوتی ہے تو زمین پر اس سے کھیتی باڑی ہوتی ہے جس سے غلہ، پھل اور بہت ساری نباتات پیدا ہوتی ہیں جنہیں انسان اور چرند پرند استعمال کرتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے کانوں اور آنکھوں کی مثال دی۔ یعنی کہ یہ دو عضو انسانوں کے لیے نہایت اعلیٰ نعمتیں ہیں اور جن کے پاس یہ نعمتیں نہیں ہوتیں وہ کس قدر لاچار اور مجبور ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی پوری دولت دے کر بھی بصارت حاصل نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی سماعت۔ اس کے بعد فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ وہ زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ نکالتا ہے۔ یہ تمام صفات ربانی اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کا اظہار ہی تو کرتی ہیں۔ یعنی مچھلیاں اور پرندے انڈے دیتے ہیں جو مردہ ہوتے ہیں، لیکن ان مردہ انڈوں سے جاندار بچے پیدا ہو جاتے ہیں اور یہی حال دیگر حیوانات کا ہے کہ ان کے جسم سے جو نطفہ نکلتا ہے وہ بھی انڈے کی مانند ہوتا ہے، جس سے ایک مکمل جاندار پیدا ہوتا ہے۔

کیا یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں۔ تو پھر یہ کافر کیوں اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے؟

اس کے بعد آیت (۳۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''کہو (اے محمد)! کیا تمہارے شرکاء میں کوئی ایسا ہے جو پہلی بار بھی پیدا کرے؟ (اور) پھر دوبارہ بھی پیدا کرے؟ کہو! اللہ ہی پہلی بار پیدا کرتا ہے (اور) پھر وہی دوبارہ بھی پیدا کرے گا۔ پھر تم کہاں پھرے جاتے ہو؟''۔ (۳۴)

اس سے پہلی آیت (۳۱) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رب ہونے کی دلیل دے کر کافروں سے سوال کیا ہے کہ اب وہ بتائیں کہ کیا وہ چیزیں جنہیں وہ پوجتے ہیں اپنا معبود مان کر کیا ان

میں یہ طاقت ہے کہ وہ کوئی چیز پیدا کر سکیں۔ کیا کبھی ایسی کوئی مثال تمہارے سامنے آئی ہے۔ یا کبھی تم نے سنا ہو کہ فلاں بت نے یا فلاں درخت نے یا فلاں قبر والے نے یا فلاں شخص نے، جس سے تم اپنی حاجت روائیاں کرتے ہو اور اپنا معبود یا اس کا شریک مانتے ہو کیا ان میں سے کسی ایک نے بھی کبھی کوئی مکھی یا پھر جتنی شے یا ان سے بھی کم شے پیدا کی ہے۔ پیدا کرنا تو درکنار یہ تو پھر کا ایک پَر بھی نہیں بنا سکتے۔ ظاہر ہے کہ تم میں سے کوئی بھی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتا اور نہ ہی آج تک کسی نے ایسا کر کے دکھایا ہے۔

تو پھر تم لوگ کیوں نہیں سمجھتے، کیوں تمہاری عقل ماری گئی ہے؟ تم لوگ کیوں کر اپنی عقل اور شعور کو استعمال نہیں کرتے؟ اور اپنے اصلی آقا اور معبود کو کیوں نہیں پہچانتے اور اس کی پرستش کیوں نہیں کرتے اور اس کے کہنے پر کیوں عمل نہیں کرتے؟ کتنے بے عقل ہیں ایسے لوگ۔

(۶) سورۃ الرعد (۱۳) آیت (۱۶) بھی اللہ تعالیٰ تعالیٰ کی ربوبیت کے بارے میں سوال کرتی ہے۔ فرمایا کہ:

"ان سے پوچھو (اے محمد)! کہ آسمانوں اور زمین کا رب (مالک) کون ہے؟ کہو! اللہ۔ کہو! کیا تم پھر بھی اس کے سوا اوروں کو اپنا حمایتی بنا رہے ہو، جو خود اپنی جان کے بُرے بھلے کا اختیار نہیں رکھتے۔ کہو! کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتا ہے؟ یا کیا اندھیرا اور روشنی برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا جنہیں یہ اللہ کے شریک ٹھہرا رہے ہیں کیا انہوں نے بھی اللہ کی طرح مخلوق پیدا کی ہے کہ ان کی نظر میں پیدائش مشتبہ ہو گئی ہو؟ کہو! صرف اللہ ہی تمام چیزوں کا خالق ہے (اور) وہ اکیلا ہے، اور زبردست غالب ہے"۔

(۷) سورۃ المومنین (۲۳) آیات (۸۴ تا ۸۹):

"(ان کافروں سے) پوچھو (اے نبی)! کہ زمین اور اس کی تمام چیزیں کس کی ہیں؟ بتاؤ اگر جانتے ہو"۔ (۸۴)

"فوراً جواب دیں گے کہ اللہ کی۔ کہو! کہ پھر تم نصیحت کیوں نہیں پکڑتے"۔ (۸۵)

"پوچھو! کہ ساتوں آسمانوں کا اور ایک باعظمت عرش کا رب کون ہے؟"۔ (۸۶)

"وہ جواب دیں گے کہ اللہ ہی ہے۔ کہو! پھر تم کیوں نہیں ڈرتے"۔ (۸۷)

"پوچھو! تمام چیزوں کا اختیار کس کے ہاتھ میں ہے؟ جو پناہ دیتا ہے اور جس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دیا جاتا، اگر تم جانتے ہو تو بتلاؤ؟"۔ (۸۸)

"یہی جواب دیں گے کہ اللہ ہی ہے۔ کہو! پھر تم کدھر سے جادو کر دیے جاتے ہو"۔ (۸۹)

اللہ تعالیٰ نے اپنی شان ربوبیت والاکل کے ساتھ بیان فرمادی۔ اور پھر کافر اور مشرکین سے پوچھا کہ جب ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، اللہ کے سوا کسی کو رب مانتے کی تو پھر انہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیوں ان کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ بس ان کا حساب تو وہی ہو گیا ہے جس کا تذکرہ سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۱۸) میں کیا گیا ہے کہ:

"یہ لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ اس لیے وہ (سیدھے راستے کی طرف) واپس نہیں آئیں گے"۔

اللہ تعالیٰ نے بارہا ان منکرین دین کو صحیح سمت لانے کی کوشش کی ہے تاکہ وہ عذاب نار سے بچ سکیں۔ اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کو ہدایت عطا کرنے کی خاطر تقریباً سوا لاکھ پیغمبر بھیجے تاکہ یہ لوگ راہ راست پر آ جائیں لیکن یہ تو سچ سننے پر تیار ہی نہیں ہوئے گویا کہ ان کے قلوب پر قفل لگ گئے، کفر اور جہالت کے، اور یہ کبھی بھی سیدھے راستے کو نہیں اپنائیں گے۔

(۸) سورۃ البقرہ (۲) آیت (۲۱) میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے خطاب فرمایا ہے، بلکہ نصیحت فرمائی ہے کہ وہ اُسی کی عبادت کریں جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ فرمایا:

"اے لوگو! پرستش کرو اپنے رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور انہیں بھی جو تم سے پہلے تھے۔ اس لیے کہ تم پرہیزگار بن سکو"۔ (۲۱-۲)

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی پرستش کو پرہیزگاری کا ذریعہ بتایا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی پرستش کرنے کا مطلب ہے کہ ہم اُسے اپنا آقا، مالک اور حاکم تسلیم کر رہے ہیں اور اس بات کا ہمیں خوف لاحق رہتا ہے کہ وہ ہمارے غلط اعمال کی وجہ سے ہم سے ناراض نہ ہو جائے۔ کیونکہ اس کی ناراضی ہمیں ایک دردناک عذاب میں مبتلا کرے گی۔ جب ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو ہمارے اندر عجز و انکسار کی صفت نمایاں ہو جاتی ہے،

جو ہمارے اندر تکبر آنے کو روکتی ہے اور ہم اللہ کی مخلوق کے ساتھ عجز و انکساری کا برتاؤ کرتے ہیں اور انسان کی یہ صفت معاشرے میں امن کی فضا پیدا کرتی ہے۔

(۹) سورۃ الروم (۳۰) آیت (۲۷) میں فرمایا گیا کہ:

"وہی ہے جو اول بار مخلوق کو پیدا کرتا ہے اور پھر سے دوبارہ (بھی) پیدا کرے گا، اور یہ تو اس کے لیے بہت ہی آسان ہے۔ یہ اس کی بہترین اور اعلیٰ صفت ہے۔ آسمانوں اور زمین پر بھی وہی غلبے والا اور حکمت والا ہے"۔

(۱۰) سورۃ المومن (۴۰) آیت (۶۵) میں فرمایا کہ:

"وہ زندہ ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس تم خالص اُسی کی عبادت کرتے ہوئے اسے پکارو۔ تمام خوبیاں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے"۔

(۱۱) سورۃ الدخان (۴۴) آیت (۷۔۸) فرمایا:

"جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو"۔ (۷)

"کوئی معبود نہیں اس کے سوا، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت، وہی تمہارا رب ہے اور تمہارے اگلے باپ داداؤں کا"۔ (۸)

(17) توحید رحمانیت

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے اور خاص کر اپنی مخلوق اعلیٰ سے بہت پیار کرتا ہے۔ کیونکہ انسان اب تک اللہ تعالیٰ کی سب سے اعلیٰ مخلوق ہے۔ جسے اس نے نہایت محبت کے ساتھ بنایا۔ ایک حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ ہماری ماؤں سے بھی ستر (۷۰) گنا زیادہ ہم سے محبت کرتا ہے۔ تو یہ پھر کیوں کر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس محبوب مخلوق کو جہنم کی آگ میں پھینکے؟

یہ ایک اہم سوال ہے جو ذہنوں میں ابھرتا ہے۔ اس کا ممکنہ جواب جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس قرینے اور قاعدے کے ساتھ اس نے اس مخلوق کو پیدا کیا ہے وہ اسی طرح سے اس کے لیے بنائے گئے قواعد، قوانین اور ادب و احترام کے ساتھ نہایت ہی نفیس طریقے سے زندگی گزارے، تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی تابعداری اور وفاداری سے خوش

ہو جائے۔ بصورت دیگر اسے اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے نتیجے میں اُسے جہنم کی سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

لیکن اللہ تعالیٰ بالکل نہیں پسند فرماتا کہ وہ اپنی اس مخلوق اعلیٰ کو جہنم کی سزا دے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی تسلسل کے ساتھ تربیت کی ہے اور اس کی آگاہی کے واسطے دنیا میں ایک لاکھ سے زیادہ پیغمبر بھیجے تاکہ وہ اپنی اقوام کی تربیت کر سکیں۔ اب جبکہ دنیا ترقی کی معراج حاصل کر چکی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے روزِ آخر تک کے لیے ایک ضابطۂ حیات مقرر فرما دیا ہے۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے ایک واضح قوانین کی ایک کتاب اور اس کو سکھانے کے لیے اور اس پر عملی طور پر عمل کر کے دکھانے کے لیے ایک استاد بھیجا، جس کی زندگی رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے ایک کامل نمونے کے طور پر رہے گی۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ انسان اس طرح سے زندگی گزارے کہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہو سکے اور جہنم کی سزا سے بچ سکے۔

ان سب تدابیر کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار بھی دے دیا کہ چاہے تو وہ اس کا تابعدار بندہ بن کر اس کے انعام و اکرام کا حق دار ہو جائے یا بصورت دیگر وہ خود اپنی مرضی سے جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنانا پسند کرے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت اس کی ہر مخلوق کے واسطے ہے، خواہ وہ جانور ہوں، پرندے یا کیڑے مکوڑے۔ وہ ہر ایک کے لیے مہربان ہے اور ان کو ہر صورت رزق مہیا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ہر انسان کے لیے رحمان ہے۔ خواہ وہ اس کے تابعدار ہوں یا نہ ہوں۔ وہ ہر ایک کو رزق عطا کرتا ہے۔ اور ہر ایک کے لیے اس نے مطلوبہ تعلیم کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ اور ان سب کے لیے قوانین پر مطلوبہ کتاب مہیا کر دی تاکہ وہ روزِ آخرت عذاب سے بچ جائیں۔

قرآن الحکیم کی چیدہ چیدہ آیات کریمہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کے متعلق بیان کی جا رہی ہیں تاکہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے متعلق مزید علم ہو جائے اور ہم ان سے استفادہ حاصل کر سکیں۔

(۱) سورۃ الرحمٰن (۵۵) میں اللہ تعالیٰ نے (۳۱) مرتبہ یہ سوال اولاد آدم سے کیا ہے

کہ: ''پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے''۔

اس سورۃ مبارکہ میں اس سوال کی مسلسل تکرار سے دو باتیں فوری طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ ان کے رب نے اُن پر نعمتوں کی اتنی زیادہ بہتات کی ہے کہ وہ ان کو گن بھی نہیں سکتے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر انسان اَن گنت نعمتوں کے باوجود بھی اپنے مہربان رب (الرحمٰن) کو نہیں پہچانتے اور اس کی تابعداری اختیار نہیں کرتے۔ حالانکہ نہایت مہربان رب اپنی عطا کے وقت یہ نہیں دیکھتا کہ کون اس کا تابعدار بندہ ہے یا نافرمان۔ اس کی عطا ہر بندے پر ہوتی ہے خواہ وہ نافرمانی ہی کیوں نہ کر رہا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہر مخلوق پر مہربانی فرمائے۔

دوسری بات ہمیں سوچنے کی دعوت دیتی ہے وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ اَن گنت نعمتوں کا ذکر فرما رہا ہے تو اس نے اپنی اعلیٰ ترین نعمتوں کا ذکر بھی ضرور کیا ہوگا۔ لہٰذا ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ کون سی اعلیٰ ترین نعمتیں ہیں تاکہ ہم ان سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔ اور ان کی زیادہ سے زیادہ قدر کر سکیں۔ چونکہ اعلیٰ ترین نعمتوں کا بیان پہلے کیا جانا ہے لہٰذا ہم سورۃ رحمٰن کی پہلی چار آیات پر غور کرتے ہیں۔

الرَّحْمٰنُ(۱) عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ(۲) خَلَقَ الْاِنْسَانَ(۳) عَلَّمَهُ الْبَيَانَ(۴)

ذرا غور فرمائیں کہ یہ چار مکمل جملے ہیں۔ آیت (۲-۴) دو الفاظ پر مشتمل ہے۔ جبکہ پہلی آیت صرف ایک لفظ پر، یعنی ایک لفظ پورا جملہ ہے۔ کیونکہ اس میں مکمل بیان ہے۔ اس ایک لفظ کا مطلب یوں سمجھ میں آتا ہے کہ: اے انسان! ذرا غور کرو تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین نعمت یہ ہے کہ وہ یعنی تمہارا رب تمہارا رحمٰن ہے۔ اور وہ تمہارے لیے سب سے زیادہ رحم کرنے والا مالک اور خالق ہے اور اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو جہنم کی آگ اور شیطان کے شر سے بچانے کی تدبیریں کرتا ہے اور وہ کبھی نہیں چاہتا کہ اس کی یہ پیاری مخلوق جہنم کی آگ میں ڈالی جائے۔ اسی لیے انسان جب گناہوں سے تھک جاتا ہے اور اسے اپنے آپ پر شرم آنے لگتی ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیتا ہے اور اس کی

معافی قبول کر لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندے کی فریاد سنتا ہے اور اس پر اپنی رحمت بھیجتا ہے، اس کے گناہوں کے باوجود وہ ان کی فریاد کو رد نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں امام ترمذیؒ نے ایک حدیث رسول ﷺ نقل کی ہے کہ جناب عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے سنا جناب نبی کریم ﷺ سے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں رحمٰن ہوں، میں نے تخلیق کیا 'رحم' اور اسے نام دیا اپنے نام میں سے۔ پس جو کوئی بھی اسے اختیار کرے تو میں اس کے ساتھ تعلق رکھوں گا اور جو کوئی اسے قطع کرے گا تو میں بھی اس سے قطع تعلق کر لوں گا''۔

دوسری اعلیٰ ترین نعمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن سکھایا۔ یعنی ایک تو ہماری تربیت کے لیے قرآن دیا اور دوسرا اسے ہمارے سمجھنے کے لیے آسان کر دیا، تاکہ ہم ابلیس اور تمام طاغوتی طاقتوں کے شر سے بچ جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے تابعدار اور فرمانبردار بندے بن کر اس کی خوشنودی حاصل کر لیں اور اس طرح سے جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔

تیسری اعلیٰ ترین نعمت یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یعنی انسانوں کو اپنی اَن گنت مخلوق میں سب سے اعلیٰ مقام پر رکھا، اور اپنی نیابت عطا فرمائی۔ اور ہمارے جدِ امجد جناب آدمؑ کو علم کی اعلیٰ ترین منزل پر رکھ کے اپنی پاک ترین مخلوق یعنی فرشتوں سے سجدہ کرایا۔ اور بتایا کہ اب انسان اپنے رب کی اعلیٰ ترین مخلوق قرار دے دی گئی، اس کے عالم ہونے کی فضیلت کی وجہ سے۔

چوتھی اعلیٰ ترین نعمت یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بیان کرنا یعنی بولنا سکھایا۔ کیونکہ علم سیکھنے اور سکھانے کا سب سے اعلیٰ ذریعہ بیان کرنا اور بیان سننا ہی ہے۔

قرآن الحکیم کے اس جملے ''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ'' کو آج اکیسویں صدی عیسوی کے دور میں ''ترسیلِ علم'' یا "Communication of knowledge" کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انسان میں علم سیکھنے کا یہ ذریعہ اپنی جگہ پر اعلیٰ ترین ہے۔ جبکہ دوسری مخلوق میں یہ ذریعہ انتہائی کم درجے تک محدود ہے۔

(۲) قرآن الحکیم کی پہلی آیت بسم اللہ میں اور پہلی سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کے دو اعلیٰ ترین صفاتی نام آئے ہیں، یعنی الرحمٰن اور الرحیم۔ ان دونوں اسماء کا مطلب ہے رحمت۔

کیونکہ ان دونوں الفاظ کی جڑ یا بنیاد 'رَحِمَ' ہے اور رحم سے رحمت۔ حالانکہ دونوں اسماء مبارکہ میں 'رحم' یا رحمت ہی مطلب ہے لیکن لفظ رحمان میں لفظ رحیم کی نسبت رحم کی وسعت بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمان صرف اس دنیا تک محدود ہے جبکہ صفتِ رحیمی زندگی کے دوسرے دور یعنی آخرت کے لیے ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت دنیا میں ہر ایک کے لیے ہے، بغیر کسی تفریق کے۔ خواہ وہ اللہ تعالیٰ کی تابعدار ہو یا نافرمان۔ دونوں اللہ کی صفتِ رحمانیت سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحیمی آخرت کی زندگی میں صرف اللہ تعالیٰ کے تابعدار بندوں کے لیے ہوگی۔

(۳) سورۃ الاحزاب (۳۳) آیت (۴۳) میں فرمایا کہ:

"اللہ تعالیٰ مومنوں پر رحیم ہے" (یعنی نہایت رحم کرنے والا مہربان ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے باور کرایا ہے اور اپنے فرمانبردار اور تابعدار بندوں کو تسلی دی ہے کہ اس کی ذاتِ پاک تم پر نہایت مہربان ہے اور مہربان رہے گی آخرت کی زندگی میں۔

(۴) سورۃ الفرقان (۲۵) آیت (۵۹) میں فرمایا:

"پھر تشریف فرما ہوا اپنے تخت پر رحمٰن"۔

اس موقع پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ حکمران جو اپنے تخت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو ان میں بہت کروفر ہوتا ہے، شان بے نیازی ہوتی ہے، تکبر اور غرور ہوتا ہے۔ لیکن وہ ہستی جو پوری کائنات اور اس کی ہر مخلوق کا خالق ہے اور مالک بھی ہے تو تخت پر جلوہ افروز ہو کر نہایت جلال و اکرام کا اظہار کرنا چاہیے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک بڑے جلال و اکرام کی مالک ہے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب وہ تخت پر جلوہ فروز ہوا تو اس کی شانِ رحمانیت اس کی صفاتِ جباری اور قہاری پر ممتاز ہوگی، کیونکہ وہ اپنی مخلوق کی دیکھ بھال نہایت پیار اور محبت سے کرتا ہے۔ لہٰذا اس کی صفتِ رحمانی اس کی دیگر تمام صفات پر حاوی ہے۔ اس لیے اس کے بندوں کو اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور گناہوں سے توبہ کر کے اپنے رحمٰن کی طرف رجوع کر لینا چاہیے۔

(۵) سورۃ الملک (۶۷) آیت (۲۹) میں فرمایا:

"کہو! وہی رحمٰن ہے تو ہم اس پر ایمان لا چکے اور اُسی پر ہمارا بھروسہ ہے"۔

(۶) سورۃ البقرہ (۲) آیت (۱۶۳) میں فرمایا کہ:

"تم سب کا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں۔ اور وہ الرحمٰن اور الرحیم ہے"۔

(۷) سورۃ الرعد (۱۳) آیت (۳۰) میں اللہ تعالیٰ نے ایک بہت اہم پیغام دیا ہے۔ اس اُمت کو اُمت سے مراد تمام دنیا کے انسان خواہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں۔ لیکن عالی جناب محمدؐ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا پیغام لائے ہیں۔ اس لیے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو جو اللہ تعالیٰ کا منکر ہے کہ:

"اس طرح ہم نے تمہیں (اے محمدؐ) اس امت میں بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں کہ تم (اے محمدؐ) انہیں ہماری طرف سے جو وحی تم پر اُتری ہے پڑھ کر سناؤ۔ یہ اللہ رحمٰن کے منکر ہیں۔ کہو (اے محمدؐ) کہ میرا پالنے والا تو وہی ہے، اس کے سوا درحقیقت کوئی بھی لائق پرستش نہیں۔ اُسی پر میرا بھروسہ ہے اور اُسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں"۔

مشرکین مکہ و عرب ایک تو جناب رسالت مآب کی تکذیب کرتے تھے، دوسرا وہ کہتے تھے کہ یہ رحمٰن اور رحیم کو ہم نہیں جانتے، ہم تو صرف اللہ کو جانتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے رسول ﷺ سے کہ یہ کفار جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پہلے والی امتوں کے انبیاء کی بھی تکذیب ہوتی تھی، بلکہ قبل یہود نے تو اپنے انبیاء میں سے کچھ کو قتل بھی کر دیا تھا۔ اس لیے آپ کو اطمینان سے اپنا فرض نبھانا ہوگا اور آپ کے ذمہ جو دعوت کا کام لگایا ہے وہ کرتے رہیں۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے رحمان ہونے کا معاملہ ہے تو اللہ رب العزت نے فرما دیا کہ رحمٰن وہی رب اور اللہ ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور اس کے تابعدار بندے صرف اُسی کی عبادت کرتے ہیں اور اُسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اپنی ہر قسم کی مدد کے واسطے۔

(۸) سورۃ بنی اسرائیل (۱۷) آیت (۱۱۰)

"کہو (اے محمد ان کفار مکہ سے)! چاہے اللہ پکارو یا رحمٰن، جس نام سے بھی پکارو تمام اچھے نام اُسی (اللہ) کے ہیں"۔

یہ آیت کریمہ بھی کفار مکہ کے لیے ہے جو اہل ایمان سے کہتے تھے کہ یہ ہمیں تو صرف اللہ کو پکارنے کو کہتے ہیں جبکہ خود اللہ کے سوا رحمٰن کو بھی پکارتے ہیں۔ اس لیے کفار مکہ کو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا ہے۔

اس کے علاوہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب کفار مکہ جناب نبی کریم ﷺ سے ایک معاہدہ کرنے پر راضی ہو گئے۔ اور اس موقع پر جناب نبی کریمؐ نے دستاویز لکھوانی شروع کی تو فرمایا لکھو! اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ اس پر اہل مکہ کے نمائندوں نے کہا کہ یہ رحمٰن کون ہے؟ ہم تو نہیں جانتے۔ لہٰذا انہوں نے صرف اللہ لکھنے پر رضامندی ظاہر کی۔ جناب نبی آخر الزماں ﷺ نے فرمایا لکھو: اللہ کے نام سے۔

اس سے پہلے بھی وہ اعتراض کر چکے تھے جب رسول کریم ﷺ نے لکھنے کے لیے کہا "من جانب 'محمد رسول اللہ'۔ اس پر کافرین مکہ نے کہا نہیں، لکھو "محمد بن عبداللہ"۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ آپ کو اللہ کا رسول مان لیں تو پھر سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔

(۹) محترمہ مریمؑ کے ہاں جناب عیسیٰؑ کی ولادت باسعادت متوقع تھی تو جبرائیلؑ ایک نوجوان انسان کی صورت میں ان کے پاس نمودار ہوئے۔ جس پر محترمہ مریمؑ نہایت خوفزدہ ہو گئیں اور فوراً مدد کے لیے پکارا۔ ان کے یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے سورۃ مریم (۱۹) کی آیت (۱۸) میں ظاہر فرمائے، کہ:

"یہ کہنے لگیں میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو کچھ بھی اس سے ڈرنے والا ہے"۔

(۱۰) جب محترمہ مریمؑ کے ہاں جناب عیسیٰؑ کی ولادت ہو گئی تو انہیں غیب سے آواز آئی کہ اگر تم سے اس بچے کے بارے میں کوئی پوچھے تو چپ رہنا اور یہ کہنا کہ میں نے رحمٰن کے نام کا روزہ رکھا ہے اور میں کسی سے بات نہ کروں گی۔

یہ واقعہ سورۃ مریم (۱۹) کی آیت (۲۶) میں ذکر کیا گیا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمانیت کا ذکر قرآن الحکیم میں جا بجا کیا ہے۔ چند آیات تو درج

بالا کر کے بیان کی جا چکی ہیں اور دیگر چند آیات کے حوالہ جات درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

i) سورۃ مریم (۱۹) آیات: ۴۴، ۴۵، ۵۸، ۶۱، ۶۹، ۷۵، ۷۸ سے ۸۵، ۸۷، ۸۸، ۹۱، ۹۲، ۹۳، اور ۹۶۔

ii) سورۃ طٰہٰ (۲۰) آیات: ۵، ۹۰، ۱۰۸، اور ۱۰۹۔

iii) سورۃ الانبیاء (۲۱) آیات: ۲۶، ۳۶، ۴۲، اور ۱۱۲۔

iv) سورۃ الفرقان (۲۵) آیات: ۲۶، ۵۹، ۶۰، اور ۶۳۔

v) سورۃ النمل (۲۷) آیات: ۳۰۔

vi) سورۃ یٰسٓ (۳۶) آیات: ۱۱، ۱۵، ۲۳، اور ۵۲۔

vii) سورۃ حٰم السجدہ (۴۱) کی آیت: ۲۔

viii) سورۃ الزخرف (۴۳) آیات: ۱۷، ۱۹، ۲۰، ۳۳، ۳۶، ۴۵، اور ۸۱۔

ix) سورۃ الحشر (۵۹) کی آیت: ۲۲۔

x) سورۃ الملک (۶۷) آیات: ۳، ۱۹، اور ۲۰۔

xi) سورۃ النبأ (۷۸) آیات: ۳۷، اور ۳۸۔

چنانچہ یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانی دوسری تمام صفات سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق اعلیٰ سے یہ چاہتا ہے کہ وہ بھی اس صفت کو اپنائیں اور حتی الامکان دوسروں پر رحم کریں۔ کوئی انسان جب دوسروں پر رحم کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے رحم کا خصوصی طور پر مستحق ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس کے خلاف عمل انسان کو اللہ تعالیٰ سے دور اور طاغوتی قوتوں کے نزدیک لاتا ہے اور اس طرح سے وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔

(ج) اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان

اس عقیدہ پر ایمان رکھنا کہ سب اچھے اور پاکیزہ نام اور صفات صرف اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ کے لیے ہیں۔ اُن میں سے کچھ اسماء گرامی اللہ تعالیٰ نے خود قرآن الحکیم اور نبی محترم ﷺ کے ذریعہ سے ہمارے علم میں لائے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ان صفات خاص اور اسماء رب العزت کے سواء کسی اور کے لیے نہ استعمال کریں۔ اکثر لوگ

عقیدتاً اپنے پسندیدہ بزرگوں کو ان جیسے صفاتی ناموں سے پکارتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کے لیے ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک صوفی بزرگ کو "غوث الاعظم" اور "دستگیر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب کہ غوث اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے لیے ہے، اور اس کا مطلب ہے "فریاد سننے والا"۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ذات ایسی نہیں ہے جو فریاد سنے۔ اس کے علاوہ "دستگیر" فارسی کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے "مدد کرنے والا"۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکت کے علاوہ کون ہے جو مدد کرتا ہے اپنے بندوں کی اور ان کی حاجت روائی کرتا ہے۔ دستگیر کا مطلب "ولی" بھی ہے۔ یہ عربی لفظ ہے اور دستگیر کے معنی میں آتا ہے۔ اور "ولی" بھی اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے۔ لہٰذا یہ قطعی طور پر جائز نہیں کہ غیر اللہ کو اُن اسماء کے ساتھ پکارا جائے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے مختص ہیں۔ اور وہ بھی اس شخص کے لیے جو دنیا میں موجود نہیں۔ اس خلاف ورزی کو اجاگر کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس انسان کی بزرگی کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔

تاریخ پر نظر دوڑائیں تو پتا چلتا ہے کہ جنگِ بدر کے میدان میں جب نالعوات رسول کریم ﷺ اپنے تین سو تیرہ اصحاب کے ساتھ ایک ہزار کفارِ مکہ کے سامنے آئے اور دونوں لشکروں سے بدر کا میدان سج گیا اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ متوقع جنگ کی تیاری شروع کر دی تو جناب رسول کریم ﷺ اپنے مقام پر جہاں سے آپؐ جنگ کی کمان کر رہے تھے اور صبح سویرے ہی جنگ کا آغاز ہوا تھا تو رسول اللہ ﷺ رات بھر "یا حیّ یا قیوم" کا ورد کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے عاجزی اور انکساری سے مدد طلب کرتے رہے۔ جبکہ آپؐ کے سپاہ "الاحد، الاحد" اور "الغوث الغوث" کے نعرے بلند کر کے اپنے مالک سے مدد چاہتے رہے اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ سے مدد چاہنا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانفال (۸) کی آیت (۴۵) میں فرمایا کہ:

"اے ایمان والو! جب تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو ان کے سامنے ڈٹ جاؤ اور اللہ کے نام کا زیادہ سے زیادہ ذکر کیا کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ"۔

اس کے علاوہ سورۃ البقرہ (۲) آیت (۱۴۵) میں فرمایا کہ:

"اور انسانوں میں سے ہیں کچھ جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کے مقابلے میں لاتے ہیں (اس کی صفات کے مطابق) وہ ان سے (غیر اللہ سے) اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح کہ اللہ سے (کرنی چاہیے)۔ لیکن جو ایمان والے ہیں وہ محبت کرتے ہیں اللہ سے، سب سے زیادہ۔ کاش کہ مشرک جان جاتے۔ جبکہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر (جان لیں گے) کہ تمام طاقت صرف اللہ ہی کے پاس ہے، اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (تو ہرگز شرک نہ کرتے)"۔

اس آیتِ کریمہ میں اس بات کا اعلان کیا گیا ہے بلکہ ان لوگوں سے پوچھا گیا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہ تم غیر اللہ سے ایسی محبت کرتے ہو جو حقیقت میں اللہ سے کرنی چاہیے تھی۔ اور تم غیر اللہ سے مانگتے ہو جبکہ تمہیں صرف اللہ سے ہی مانگنا چاہیے، جو تمہیں دیتا ہے اور وہی دینے کے قابل ہے۔ جبکہ تم ان لوگوں سے مانگتے ہو جو قبروں میں تمہاری آواز تک نہیں سن سکتے۔ اور فرض کرو کہ اگر وہ سن بھی لیں تو پھر وہ تمہاری ذرہ برابر مدد نہیں کر سکتے اور ان لوگوں کی تنگ نظری یہ کہ غیر اللہ کو جو نہ تو انہیں دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی پکار سن سکتے ہیں، انہیں اپنا ولی اور مددگار سمجھ کر ان سے سوال کرتے ہیں۔ اس سے بڑا کفر اور شرک اور کیا ہوگا؟

جبکہ ان لوگوں کو بتا دیا گیا ہے کہ شرک اللہ تعالیٰ کو سب برائیوں سے زیادہ ناپسند ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا کہ اگر وہ چاہے گا تو ہر قسم کے گناہ معاف فرما دے گا، اپنے بندوں کے۔ لیکن شرک کبھی معاف نہیں کرے گا۔ کیونکہ شرک اللہ تعالیٰ کے ساتھ ناانصافی اور سب سے بڑا ظلم ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء (۴) آیت (۴۸) میں فرمایا کہ:

"یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ (کسی کو) شریک کیے جانے کو نہیں بخشتا۔ اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دے اور جو اللہ کے ساتھ شریک مقرر کرتے ہیں اس نے بہت بڑا گناہ کیا اور بہتان باندھا (اللہ پر)"۔

ایسے بہت سارے لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں وہ بھی قبیح شرک میں مبتلا ہو

جاتے ہیں۔ جیسے اس سے قبل بتایا جاچکا ہے کہ ایک بزرگ جو کہ اب دنیا میں نہیں ہیں انہیں غوث الاعظم (بڑا مددگار) کہتے ہیں، بہت سے لوگ ایک بزرگ کو "داتا" یعنی عطا کرنے والا کہہ کر پکارتے ہیں، بہت سے لوگ ایک بزرگ کو "غریب نواز" یعنی غریبوں کو عطا کرنے والا کہہ کر پکارتے ہیں۔ جبکہ ایک اور بزرگ کو "لج پال" یعنی عزت رکھنے والا کہہ کر پکارتے ہیں اور پھر ان بزرگوں کی قبور پر جاکر ان سے باقاعدہ مانگتے ہیں۔ یہ سب کچھ کھلا شرک ہے۔ انہیں اپنی حاجت روائی صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکت سے کرنی چاہیے جبکہ وہ ماسوا اللہ سے مانگتے ہیں اور اپنی حاجت روائی کرتے ہیں۔ ان سے مدد چاہتے ہیں حالانکہ ہمارے ایمان کا یہ حصہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکت ہی رزق عطا کرتی ہے، ہماری راہنمائی کرتی ہے، ہماری مشکلوں کو حل فرماتی ہے اور اس ذاتِ عالیہ کے علاوہ کوئی بھی ذات ایسی نہیں جو کسی کی حاجت روائی کر سکے۔

جب اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ وہ ہماری ماؤں سے بھی ستر گنا زیادہ ہم سے محبت فرماتا ہے تو پھر وہ ہماری عرض گزارش کیوں نہ سنے گا۔ جب اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ ہماری نشوونما کرنے اور ہمیں پالنے کی ذمہ دار ہے، ہمارے پیدا کرنے کے بعد، تو کیا پھر ہمارے لیے رزق کوئی اور مہیا کرے گا؟ اس لیے ان لوگوں سے گزارش ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے مانگتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کریں اور آئندہ کے لیے یہ گناہِ عظیم کرنے سے توبہ کریں اور ہمیشہ اپنا دکھ درد اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کریں اور اپنے آپ کو قیامت کے بعد والے عذاب سے بچالیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ شرک کرنے والوں کو کبھی معاف نہ کرے گا۔

اس کے علاوہ ایک اور بہت بڑا شرک کیا جاتا ہے وہ یہ کہ غیر اللہ کو "مولا" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور لفظ مولانا تو ہر اس بندے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو مسجد سے یا دینی علوم سے منسلک ہوتے ہیں۔ حالانکہ لفظ مولانا دیا ہے (مولا+نا) سے، جس کا مطلب ہوتا ہے ہمارے مولا یا ہمارے آقا یا ہمارے مالک۔

جب کہ ہمارا اور تمام مخلوقات کا مولا صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ ہے۔

سورہ بقرہ (۲) کی آیت (۲۸۶) میں یا یوں کہیے کہ سورۃ بقرہ کے آخری الفاظ ہیں:

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

"آپ ہی ہمارے مالک ہیں (بس) ہمیں کافروں کی قوم پر غلبہ عطا فرما"۔

ایک روایت کے مطابق جنگِ اُحد میں ابوسفیان نے اہلِ مدینہ کو طعنہ دیا تھا کہ ان کے پاس تو "العزیٰ" ہے (یہ ایک بت تھا) اور تمہارے پاس تو کچھ نہیں۔ اس پر عالیجناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحابہ سے فرمایا کہ ... "کہو (اے مسلمانو)! کہ: اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ.

"اللہ ہمارا مددگار ہے جبکہ تمہارا مددگار کرنے والا تو کوئی نہیں"۔

مزید برآں سورۃ الانفال (۸) کی آیت (۴۰) میں فرمایا گیا کہ:

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝

"اگر وہ پھر جائیں، تو جان لو کہ اللہ (ہی) تمہارا مولا ہے۔ (کیا) خوب مولا اور (کیا) بہترین مددگار!"۔

اس کے علاوہ سورۃ الاعراف (۷) آیت (۱۹۷۔۱۹۸) میں فرمایا کہ:

"اور وہ جنہیں تم پکارتے ہو اللہ کے سوا، (وہ) تمہاری مدد نہیں کر سکتے، (بلکہ) وہ خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے"۔ (۱۹۷)

"اور اگر تم انہیں پکارو اپنی ہدایت کے لیے، یا کچھ سنانے کے لیے تو وہ تمہیں سن ہی نہیں سکتے۔ تمہیں ایسا لگے گا کہ وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دیکھ نہیں سکتے"۔ (۱۹۸)

اسی ضمن میں اس سورۃ میں اس سے قبل بھی بیان کیا جاچکا ہے آیات (۱۹۱ تا ۱۹۳) میں۔

"کیا (وہ) ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی شے کو پیدا نہ کر سکیں، (بلکہ) وہ خود ہی پیدا کیے گئے ہوں"۔ (۱۹۱)

"اور وہ ان کو کسی قسم کی مدد نہیں دے سکتے اور وہ خود اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے"۔ (۱۹۲)

"اور اگر تم ان کو کوئی بات بتانے کو پکارو تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں۔ تمہارے لیے، دونوں باتیں برابر ہیں کہ خواہ تم ان کو پکارو یا خاموش رہو (یعنی بلکہ سننے کے قابل ہیں اور نہ ہی بولنے کے)"۔ (۱۹۳)

افسوس صد افسوس کہ جن صفاتی ناموں سے اللہ تعالیٰ کو پکارنا چاہیے، جاہل لوگ ان ناموں سے اللہ کے غلاموں کو پکارتے ہیں۔ بے شک یہ امر اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناگوار گزرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسے ظلم عظیم قرار دیا ہے۔

اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف (۷) آیت (۱۸۰) میں فرمایا ہے کہ:

"اور اچھے اچھے نام (اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی) اللہ تعالیٰ ہی کی ذات اقدس کے لیے ہیں۔ سو ان ناموں سے (صرف) اللہ ہی کو موسوم کیا کرو۔ (اور) ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس (اللہ) کے ناموں کی کج روی کرتے ہیں۔ (اس لیے) ان لوگوں کو ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی"۔

اس لیے ہم پر لازم ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ایسے اسماء گرامی اور صفات جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہوں، ان اسماء سے کسی اور کو پکارنا جائز نہیں۔ مثلاً رحمٰن، رحیم، قادر، رزاق، حیّ وقیوم، صمد، رب، قدوس، غفار، غفور، غنی، کریم وغیرہ۔ اگر حضرات اپنی اولاد کے نام ان اسماء الحسنیٰ کے ساتھ عبد کا اضافہ کر کے رکھتے ہیں جیسے عبدالغفار، عبدالقدوس، عبدالرحمٰن وغیرہ، ان کا مطلب ہوا غفار کا غلام، قدوس کا غلام، رحمٰن کا غلام یا نوکر وغیرہ۔ لیکن احباب کی جہالت کو کیا کہیے بظاہر پڑھے لکھے لوگ ان لوگوں کو اللہ کے ناموں سے ہی پکارتے ہیں اور لفظ "عبد" کو ساتھ رکھ کر نہیں پکارتے۔ یہ نہایت بے ادبی کا عمل ہے، اور لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے گناہ عظیم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء مبارکہ کے بارے میں سورۃ الحشر (۵۹) آیت (۲۴) میں فرمایا ہے کہ:

"وہی اللہ ہے پیدا کرنے والا (الخالق)، وجود بخشنے والا (البارئ)، صورت بنانے والا (المصور)۔ اُسی کے لیے ہیں (نہایت) اچھے نام۔ ہر چیز خواہ وہ آسمانوں میں ہو یا زمین پر، اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور وہی ہے غالب (العزیز) حکمت والا (الحکیم)"۔

اس کے علاوہ سورۃ الاسراء (۱۷) آیت (۱۱۰) میں فرمایا گیا:

"کہو (اے محمدؐ) اللہ کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو تمام اچھے نام

اُسی کے ہیں"۔

بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں منقول ہے کہ: "ہمارا رب ہر رات آسمان دنیا پر جب، رات کی آخری تہائی باقی ہوتی ہے، اُتر کر فرماتا ہے: کون ہے جو مجھے پکارتا ہے کہ میں اسے جواب دوں؟ کون مجھ سے سوال کرتا ہے کہ میں اسے عطا کروں؟ کون مجھ سے مغفرت کی درخواست کرتا ہے کہ میں اسے بخش دوں؟"۔

صفات باری کے متعلق امام احمدؒ کا ایک فرمان درج ذیل کیا جاتا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی صفات مبارکہ کے متعلق ایمان کی کیفیات سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

"فرمایا: جناب امام احمدؒ نے کہ اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ روز قیامت نظر آئے گا۔ وہ تعجب کرتا ہے، وہ ہنستا ہے، وہ ناراض ہوتا ہے، وہ راضی ہوتا ہے، ناپسند کرتا ہے اور محبت کرتا ہے۔ امام صاحب یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہم حقیقت اور کیفیت بیان کیے بغیر ان سب صفات پر ایمان لاتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں، یوں سمجھیں کہ ہم یقین کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نزول کرتا ہے، عرش پر مستوی ہے اور مخلوق سے جدا ہے۔ مگر ہم اس کے نزول، اس کی رویت اور اس کے استواء کی کیفیت نہیں جانتے اور نہ ہی اس کا حقیقی مفہوم اور مطلب ہماری دریافت میں ہے۔ ہم اس بات کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں، جس نے یہ بات خود کہی ہے، اور اپنے رسولؐ کی طرف وحی کی ہے اور ہم رسول اللہؐ کی تردید بھی نہیں کرتے (بلکہ ان کی تصدیق کرتے ہیں)۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے ثابت شدہ ان صفات کے علاوہ ہم کسی صفت کے قائل نہیں اور نہ ہی اس میں کسی حد بندی اور انتہا کے قائل ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے"۔

بہر حال یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی اور سمجھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور مخلوق کی صفات ایک جیسی نہیں، بالکل اُسی طرح سے جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ مخلوق کی ذات کی طرح نہیں۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یہ میرا ہاتھ ہے" تو اس کے ہاتھ کا ہم تصور نہیں کر سکتے، اور نہ ہی اس کے ہاتھ کو کسی مخلوق کے ہاتھ سے لا سکتے ہیں، اسی طرح سے اللہ کا تعجب کرنا، اس کا ہنسنا، ناراض ہونا، راضی ہونا، محبت کرنا، ناپسند کرنا، وغیرہ کسی بھی مخلوق

جیسا نہیں۔ اور یہ سب کچھ کیسا ہے ہمیں معلوم نہیں۔

پس ہمارے لیے یہ کافی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا اپنی ذات یا کمال اور صفات لاجواب کے متعلق اور اس بارے میں جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے بتلادیا ہم اس پر یقین کرتے ہیں اور ایمان رکھتے ہیں کہ وہ سچ ہے ہمیں اس بارے میں مزید کسی گرید کی ضرورت نہیں۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق سورۃ الشوریٰ (۴۲) آیت (۱۱) میں جو کچھ فرمادیا وہی ہمارے لیے انتہائے علم ہے فرمایا گیا کہ:

"اس کی مانند کوئی چیز نہیں، اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے"۔

ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ قرآن الحکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی امیؐ کی صفات کا اظہار دو ایسے الفاظ میں فرمایا ہے جو کہ خود اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں۔ یعنی آپؐ کے لیے رؤف اور رحیم کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان الفاظ کے معنی کی جو وسعت اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ کے لیے ہے وہ نبی کریمؐ کے لیے نہیں ہوگی، بلکہ آپؐ کی ذات کے مطابق محدود ہوگی۔ کیونکہ مخلوق کی صفات کسی صورت بھی اللہ تعالیٰ کی صفات کی برابری نہیں کرسکتیں۔

متذکرہ الفاظ قرآن الحکیم کی سورۃ توبہ (۹) کی آیت ۱۲۸ میں آئے ہیں۔

۳۔ فرشتوں پر ایمان

فرشتوں پر ایمان لانے سے پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ فرشتے کون ہیں اور کیا ہیں؟ اور ان پر کیا ایمان لائیں اور ان پر ایمان لانے کی ضرورت کیوں کر پیش آئی؟ اور دیگر یہ کہ فرشتوں کے ساتھ کیا ہمارا براہ راست کوئی تعلق ہے؟ یا یہ کہ صرف اس وجہ سے ایمان لائیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ لیکن پھر بھی ہمارے لیے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آخر اس میں اللہ تعالیٰ کی کیا حکمت ہے۔ تاکہ ہمارے ایمان کے اس حصے میں کوئی شبہ نہ رہے اور ہمارا ایمان کامل ہو جائے۔

تاریخ کے اوراق ہمیں بتاتے ہیں کہ عالیجناب رسول کریم ﷺ کی بعثت کے وقت بھی اور آپؐ سے پہلے ادوار میں بھی کفار فرشتوں کو اللہ تعالیٰ واحدہ لاشریک لہٗ کی بیٹیاں قرار دیتے اور پھر ان کی پرستش کرتے اور وجہ یہ بتاتے کہ یہ اللہ تعالیٰ سے ہماری سفارش کر کے ہماری مرادیں پوری کرائیں گی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ قوم شرک عظیم کے بڑے گناہ میں شریک تھی جس سے اللہ تعالیٰ کو بے حد نفرت ہے۔

اس لیے ایمان والوں کے لیے یہ ضروری ٹھہرا کہ وہ فرشتوں کے بارے میں یہ جان لیں کہ وہ نوری مخلوق ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نہایت تابعدار اور فرمانبردار ہے، جو ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء میں مشغول رہتے ہیں اور اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے کوئی حکم صادر ہو تو وہ اس کی تعمیل کریں۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ فرشتے نورانی مخلوق ہیں جبکہ شیاطین یا جنات کی تخلیق آگ کے شعلے سے ہوئی اور انسان کی تخلیق مٹی کے گارے سے کی گئی۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مختلف کاموں پر لگایا ہوا ہے، عبادت کے علاوہ۔ مثلاً ہر انسان پر دو فرشتے مقرر ہیں جو اس کے اعمال قلمبند کرتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے

ان کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ فرشتوں کی تعداد کا علم نہیں لیکن یہ بے شمار ہیں۔ ان میں چار مقرب فرشتے ہیں یعنی جبرائیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ اور عزرائیلؑ۔ یہ مقرب فرشتے سب سے زیادہ مرتبے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ذمہ مختلف کام لگا رکھے ہیں، عبادات اور تسبیح کے علاوہ۔

قرآن الحکیم میں فرشتوں کے متعلق متعدد آیات موجود ہیں جن سے ان کے متعلق کافی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا چند آیات تشریح درج کی جارہی ہیں۔

سورۃ الحاقہ (۶۹) آیت (۱۷) میں فرمایا کہ:

(۱) "اور فرشتے اس (عرش) کے اطراف ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز (روزِ قیامت) اٹھائے ہوئے ہوں گے تمہارے رب کے عرش کو"۔

(۲) سورۃ مدثر (۷۴) آیت (۳۱) میں فرمایا کہ:

"ہم (اللہ) نے دوزخ کے داروغے صرف فرشتے ہی مقرر کیے ہیں"۔

اس سے پہلے والی آیت (۳۰) میں جہنم کے فرشتوں کی تعداد اللہ تعالیٰ نے ۱۹ بتائی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب جہنم کے فرشتوں کا ذکر ہوا تو ابوجہل نے قریش سے کہا کہ کیا ان میں سے ہر دس (۱۰) آدمیوں کا ٹولہ ایک ایک فرشتے کے لیے کافی نہیں ہوگا۔ تو یہ آیت ان لوگوں کے لیے ہے۔

(۳) سورۃ السجدہ (۳۲) آیت (۱۱) میں فرمایا:

"کہو (اے محمدؐ)! کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روحیں قبض کرلیتا ہے"۔

(۴) سورۃ الصّٰفّٰت (۳۷) آیت (۱۴۹ تا ۱۵۱) اور (۱۶۴ تا ۱۶۶) اور (۱۵۹)

☆ "ان سے دریافت کرو! کہ کیا تمہارے رب کی تو بیٹیاں ہیں اور ان کے بیٹے؟"۔ (۱۴۹)

☆ "یا یہ اس وقت موجود تھے جبکہ ہم نے فرشتوں کو مؤنث پیدا کیا؟"۔ (۱۵۰)

☆ "آگاہ رہو! کہ یہ لوگ صرف اپنی افترا پردازی سے کہہ رہے ہیں"۔ (۱۵۱)

☆ "جو کچھ یہ (اللہ کے بارے میں) بیان کررہے ہیں، اس سے اللہ تعالیٰ بالکل

پاک ہے"۔ (۱۵۹)

☆ "(فرشتوں کا قول ہے)' ہم میں سے ہر ایک کی جگہ مقرر ہے"۔ (۱۶۴)

☆ "اور ہم تو (بندگیٔ الٰہی میں) صف بستہ کھڑے ہیں"۔ (۱۶۵)

☆ "اور اُس کی تسبیح بیان کررہے ہیں"۔ (۱۶۶)

(۵) اہلِ یہود جناب جبرائیلؑ سے بغض رکھتے تھے اور جناب میکائیلؑ کو اپنا دوست کہتے تھے۔ یہ بات اس وقت سامنے آئی جب اہلِ یہود میں سے کسی نے ایک صحابی سے پوچھا کہ تمہارے نبیؐ پر کون وحی لاتا ہے تو انہوں نے کہا: "جبرائیلؑ" اس پر انہوں نے جناب جبرائیلؑ سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کا جواب سورۃ بقرہ (۲) آیت (۹۷۔۹۸) میں دیا جارہا ہے۔ فرمایا:

"کہو (اے محمدؐ)! جو کوئی بھی دشمن ہے جبرائیلؑ کا اُسے غصے کی جلن میں مرنے دو، بے شک وہ لایا ہے (قرآن) اور اتارا تمہارے قلب پر اللہ کے اذن سے، جو تصدیق کرتا ہے (اس کی) جو آیا اس سے قبل (یعنی توریت اور انجیل) اور ہدایت اور خوشخبریاں ایمان والوں کے لیے"۔ (۲:۹۷)

"اور جو کوئی بھی دشمن ہے اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے رسولوں کا، جبرائیلؑ اور میکائیلؑ کا، پھر تو اللہ بے شک دشمن ہے ایمان نہ لانے والوں کا"۔ (۹۸)

صحیح بخاری میں جناب ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ:

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جو کوئی بھی میرے کسی دوست کو اپنا دشمن سمجھے تو اس نے مجھ سے جنگ چھیڑ دی، ... یعنی خواہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ ہو، اس کا پیغمبر ہو، یا ولی۔ جو بھی ان سے دشمنی کرے گا، ان کو بُرا بھلا کہے گا یا انہیں کوئی تکلیف پہنچائے گا تو (پھر) وہ سمجھ لے کہ اس نے اُن کے مالک اور ولی کو ناراض کیا، اور اسے اپنا دشمن بنا لیا"۔

(۶) جیسا کہ اس سے قبل بتایا گیا ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی ایک نورانی مخلوق ہے۔ اور ان کی اپنی کوئی خواہش نہیں ہوتی نہ ہی ان کی کوئی مرضی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے مالک اور خالق کے حکم کے منتظر اور تابع ہوتے ہیں اور اس کی حمد و ثناء میں مصروف رہتے ہیں۔ اس

سلسلے میں امام ترمذیؒ نے جناب ابوذر غفاریؓ سے ایک حدیث نقل کی ہے، کہ فرمایا جناب رسول ﷺ نے کہ:

"میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے، اور سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ جنت میں مسلسل ایک درد بھری آواز سنائی دیتی ہے اور اس میں کوئی اچنبھا نہیں کہ اس میں چار انگلیوں سے زیادہ کوئی جگہ نہیں کہ وہاں کوئی فرشتہ موجود نہ ہو، اپنا سر سجدے میں رکھے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے حضور۔ اللہ کی قسم اگر تم جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم ہنسو گے کم اور رو گے زیادہ۔ اور تم اپنے ازدواجی تعلقات سے لطف اندوز نہ ہو سکو گے اور نکل جاؤ گے گلیوں میں اللہ کی تسبیح کرنے کے واسطے"۔

امام بخاریؒ نے ایک اور حدیث روایت کی ہے ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے کہ:

"جو بھی دعویٰ کرتا ہے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو وہ ایک بڑا جرم کرتا ہے۔ بلکہ آپؐ نے صرف جبرائیلؑ کو ان کی اصلی حالت میں دیکھا ہے، جو تمام آسمان پر چھائے ہوئے تھے"۔

اس حدیث کا یہاں نقل کرنا اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے مشہور کر رکھا ہے کہ معراج کے موقع پر جناب رسول کریم ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا ... جو کہ درست نہیں۔

(۷) سورۃ مریم (۱۹) آیت (۱۷ تا ۲۱):

جب مریم نے اپنے لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لی ایک نامعلوم جگہ پر اس خوف سے کہ جب انہیں محسوس ہو رہا تھا بچے کی پیدائش کا معاملہ۔ انہیں خوف تھا اس بات کا کہ وہ اپنے کنبے اور دیگر لوگوں کو کیا جواب دیں گی، اور وہ حیران بھی تھیں کہ انہیں تو کبھی بھی کسی مرد نے نہیں چھوا تو پھر یہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت جناب جبرائیلؑ ان پر ظاہر ہوئے تا کہ ان پر معاملہ ظاہر کریں، اللہ کے حکم سے۔ اس لیے وہ واقعہ متذکرہ بالا آیات میں مذکور ہے جو درج ذیل کی جا رہی ہیں۔

☆ انہوں نے (مریم نے) ایک حجاب ڈال لیا اپنے آپ کو چھپانے کے لیے پھر

ہم (اللہ) نے بھیجا ان کے پاس ہمارا روح جبرائیلؑ، جو ان کے سامنے ظاہر ہوا ایک انسان کی صورت میں"۔ (۱۷)

☆ "اس نے کہا: بیشک میں پناہ مانگتی ہوں رحمٰن کی تم سے، اگر تم اللہ سے ڈرتے ہو"۔ (۱۸)

☆ جبرائیلؑ نے کہا: میں تو صرف ایک پیغام دینے والا ہوں تمہارے رب کی طرف سے، (کہ اطلاع دوں) تمہیں ایک ستھرے کی ایک نیک بچے کی صورت میں"۔ (۱۹)

☆ "اس نے کہا: مجھے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کسی شخص نے مجھے چھوا تک نہیں اور نہ ہی میں بدکار ہوں"۔ (۲۰)

☆ "اس نے کہا: بس (ایسا ہی ہوگا) تمہارے رب نے کہا ہے: یہ آسان ہے میرے لیے اور ہم چاہتے ہیں اُسے ایک نشانی بنانا انسانوں کے لیے اور ایک رحمت ہماری طرف سے، اور یہ معاملہ طے ہو چکا ہے (اللہ کی طرف سے)"۔ (۲۱)

پھر ان سے اگلی آیات میں جناب عیسیٰؑ کی پیدائش کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس بیان کردہ آیات کا مقصد یہاں پر صرف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح سے اپنے فرشتوں سے کام لیتا ہے۔ اور کس طرح اس کے فرشتے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

(۸) سورۃ الانفال (۸) آیت (۹) جنگِ بدر کے موقع پر نازل ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ اور ان کے پیروکاروں سے ان کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ فرمایا کہ:

"(یاد کرو) جب تم نے مدد چاہی اپنے رب سے، اور اُس نے تمہیں جواب دیا (یہ کہتے ہوئے): میں تمہاری مدد کروں گا ایک ہزار فرشتوں سے (جو) ایک دوسرے کے پیچھے (آئیں گے) لگاتار"۔ (۸:۹)

اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ روایت کیا علی بن ابی طلحہؒ نے کہ فرمایا ابن عباسؓ نے کہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کی مدد فرمائی، ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ، جن میں پانچ صد تو جناب جبرائیلؑ کے ماتحت ایک طرف تھے جبکہ دوسری طرف پانچ صد تھے میکائیلؑ کے ماتحت۔

سورۃ الانفال (۸) ہی کی آیت (۵۰) مزید تفصیل بیان کرتی ہے اسی سلسلے میں کہ:

"اگر تم دیکھ سکتے کہ جب فرشتے ان کافروں کی ارواح قبض کرتے ہیں تو مارتے ہیں ان کے چہروں پر اور پشت پر، یہ کہتے ہوئے کہ: اب چکھو مزا دہکتی آگ کا"۔

سورۃ الانفال (۸) ہی کی آیت (۱۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"(یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے الہام کیا فرشتوں کو: بے شک! میں تمہارے ساتھ ہوں، پس تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ، میں بھی کفار کے قلوب پر خوف طاری کردوں گا، پس مارو ان کی گردنوں پر اور مارو ان کی انگلیوں اور پنجوں پر"۔

امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ربیع بن انس نے کہا کہ: "بدر کی لڑائی کے بعد لوگ آسانی سے پہچان سکتے تھے کہ مقتولین میں سے کسے فرشتوں نے قتل کیا ہے اور کسے لوگوں نے، کیونکہ جنہیں فرشتوں نے قتل کیا ہوتا تو ان کی لاشوں پر قتل کی جگہ یعنی گردنوں، انگلیوں اور پنجوں پر جلنے کے نشانات تھے۔ جیسے کہ وہ جگہیں آگ سے جلی ہوں یعنی آگ سے کاٹی گئی ہوں۔ تو یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ انہیں فرشتوں نے قتل کیا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کی تلواریں بجلی کی ہوں گی۔

(۹) سورۃ الغافر (۴۰) آیت (۷) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وہ فرشتے جو اس کے مقرب ہیں اس کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، اور وہ جو اس کے گرد ہیں وہ سب کے سب تسبیح کرتے ہیں اور حمد بیان کرتے ہیں اپنے رب کی اور ایمان رکھتے ہیں اس پر اور بخشش چاہتے ہیں ایمان والوں کے لیے (یہ کہتے ہوئے) 'اے ہمارے رب! آپ کی رحمت اور علم نے تمام چیزوں کو گھیر رکھا ہے (یعنی وسیع تر ہے)، پس آپ معاف فرمادیں ان کو جو توبہ کرتے ہیں اور آپ کا بتایا ہوا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اور بچایے ان کو بھڑکتی آگ کے عذاب سے'۔

یہ آیتِ مبارکہ اور اس سے اگلی چند آیات ایمان والوں کے لیے نہایت تسلی اور تقویت کا باعث ہیں۔ پس ہمیں لازم ہے کہ ہم اللہ کے راستے پر مستحکم رہیں، اللہ کی تسبیح کریں اور اس سے اپنی بخشش کے طلبگار رہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ ہمیں معاف کرنے کے

لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بہت عنایت ہے کہ وہ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے کہ وہ بھی اس کے مومن بندوں کے لیے دعائے خیر کرتے رہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بہت چاہتا ہے اور ان سے بے انتہا محبت فرماتا ہے۔

افسوس صد افسوس، اُن بندوں پر جو اپنے مالک کی نافرمانیاں کرتے ہیں اور انہیں یہ احساس ہی نہیں کہ وہ کس قدر گمراہی میں مبتلا ہیں، اور ان کی یہ گمراہی ان کے لیے کس قدر پچھتاوے کا باعث بنے گی۔ اور جب وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں ڈالے جائیں گے تو وہاں چیخیں گے اور اپنی موت کو پکاریں گے۔ یہاں تک کہ جہنم کے داروغہ سے کہیں گے کہ اپنے رب سے کہو کہ ہمارا خاتمہ کردے۔ لیکن یہ ممکن نہ ہوگا۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا سورۃ الزخرف (۴۳) آیت (۷۷) میں کہ:

"اور وہ (نافرمان) چیخیں گے (اور کہیں گے) 'اے مالک! (داروغہ جہنم) اپنے رب سے کہو! کہ ہمارا خاتمہ کردے' (اس پر) وہ کہے گا: بے شک تم لوگ یہاں ہمیشہ کے لیے لائے گئے ہو"۔

۴۔ الہامی کتب پر ایمان

اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو جو لہم و دانش عطا فرمائی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی دیگر تمام مخلوقات سے اعلیٰ و افضل ہے۔ اس کے باوجود عقلِ انسانی مابعدالطبیعاتی قوتوں کے متعلق آگاہ نہیں۔ اس دورِ جدید میں انسانی عقل اپنی انتہائی منزلوں کو چھو رہی ہے۔ یہ اس کا کمال ہے کہ اس نے بجلی کی رفتار (جو ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے) کو مدنظر رکھتے ہوئے بجلی سے ہی کام لینا شروع کر دیا ہے۔ یعنی اس نے ایک ایسی مشین تیار کر لی ہے جو بجلی کی رفتار سے کام کرتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ "برق رفتاری" کے الفاظ محاورے کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ لیکن آج برق رفتاری سے کام کا ہونا ایک حقیقت بن گیا ہے، جو ایک معجزے سے کم نہیں کیونکہ معجزہ نام ہے اس کام کا جس سے عقلِ انسان حیرت زدہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ عقلِ انسانی زمین کی خلائی حد کو توڑ کر کششِ ثقل سے باہر جانے میں بھی کامیاب ہو گئی ہے اور نظامِ شمسی کے سیاروں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

عقل کی انتہائی منزل پر پہنچنے کے باوجود انسان تاحال مابعدالطبیعاتی حقیقتوں سے آشنا نہ ہو سکا۔ مثلاً وہ نہیں جان سکا کہ جنت، دوزخ، عرش، فرشتے، روح، اللہ تعالیٰ کی حقیقتیں کیا ہیں۔ ان کے متعلق یا اور ایسی بہت سی حقیقتوں کے متعلق ہمیں جو کچھ بھی علم حاصل ہوا وہ علم الہام کے ذریعہ سے حاصل ہوا۔ یعنی اتنا علم جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا۔ لیکن آج بھی وہ لوگ جنہوں نے علم الہام کو نہ مانا وہ ایسی کسی بھی حقیقت کو نہیں جان سکے۔

علمِ الہام سے ہی ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انسان کی انتہائی منزل وہ ہے جہاں سے ہمارے اجداد دنیا میں بھیجے گئے تھے اور آدم و اولادِ آدم کا واپس اس مقام پر جانا اس بات سے مشروط کر دیا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے خالق اور مالک کی مکمل تابعداری کرے گا اور اس

کی ہدایات کے مطابق دنیا میں زندگی گزارے گا تو پھر وہ اپنے آبائی گھر میں جا سکے گا۔ بصورتِ دیگر اللہ تعالیٰ سے سزا پائے گا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور کے انسان کو اپنی طرف سے اس کی آگاہی کے لیے علم عطا فرمایا۔ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا تابعدار بندہ بن کر اس کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ اب اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے علمِ الہام مکمل کر دیا ہے، یعنی انسان کی الہامی تعلیم کے لیے آخری مکمل کتاب جو مکمل نصاب پر مبنی ہے بھیج دی۔ نہ صرف یہ کہ اس کتاب کے علم کو سکھانے کے لیے ایک استاد بھی بھیجا، جس نے اس کے قوانین پر عمل کر کے اپنے آپ کو مثال بنا کر پیش کر دیا، تاکہ رہتی دنیا تک انسان انہی اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزاریں۔

اب قرآن الحکیم کی چیدہ چیدہ آیاتِ مبارکہ پیش کی جاتی ہیں جن سے چند اساتذہ کرام اور چند الہامی کتابوں کے متعلق علم ہو سکے۔

(۱) سورۃ البقرہ (۲) آیت (۱۳۶) فرمایا گیا کہ:

"کہو (اے مسلمانو)! ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہمارے واسطے، اور جو نازل کیا گیا ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر، اور جو کچھ دیا گیا موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو۔ اور جو کچھ بھی دیا گیا دیگر انبیاءؑ کو ان کے رب کی طرف سے اور ہم تفریق نہیں کرتے ان میں سے کسی کے درمیان اور ہم جھکاتے ہیں اپنے نفوس کو اس کے سامنے، یعنی ہم مسلمان ہیں۔ اللہ کے تابعدار بندے"۔ (۲۔ ۱۳۶)

اسی سورۃ البقرہ کی آیت (۹۱) میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان نہ لائے، بلکہ وہ ایسے گمراہ تھے کہ اپنے انبیاء کے قتل میں بھی ملوث ہوئے۔ چنانچہ آیتِ مذکورہ میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اُتاری ہوئی کتاب پر ایمان لاؤ، تو کہہ دیتے ہیں کہ 'جو (کتاب) ہم پر اُتاری گئی ہے اس پر ہمارا ایمان ہے۔ حالانکہ اس کے بعد والی (کتاب) جو اُن کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے، کفر کرتے ہیں۔ اچھا! ان سے پوچھ دریافت کرو کہ اگر تمہارا ایمان پہلی کتابوں پر ہے تو پھر تم نے اگلے انبیاءؑ کو کیوں

قتل کیا؟''۔ (۹۱:۲)

یہ کیفیت کہ یہ ذلیل یہود کے لیے ہے، جن میں سے زیادہ تر نے نہ تو انجیل اور نہ ہی قرآن کو تسلیم کیا۔ حالانکہ تورات اپنے بعد والی کتب کے آنے کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن انہوں نے نہ تو ان کتابوں کو تسلیم کیا بلکہ اپنے پیغمبروں کو قتل بھی کیا۔ اس کی سب سے بڑی مثال تو جناب عیسیٰؑ کی ہے۔ جنہیں اللہ کا پیغمبر ماننے کی بجائے انہیں قتل کر دیا۔ وہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جناب مسیحؑ کو قتل نہ ہونے دیا اور اپنی طرف اٹھا لیا۔ اس کے علاوہ ان کی سب سے زیادہ قبیح حرکت یہ تھی کہ انہوں نے جناب رسالت مآب ﷺ کو قتل کرنے کی تین مرتبہ کوشش کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ذلیل حرکت کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ جب یہ اس معاملے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے عالیجنابؐ پر جادو کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اسے بھی ناکام کر دیا۔ پھر ان لوگوں نے آپؐ کو زہر کھلانے کی کوشش کی، اللہ تعالیٰ نے اس حملے سے بھی آپؐ کو بچا لیا۔ اور جب اس زہر ملے گوشت کا لقمہ آپؐ کے ہونٹوں سے مس ہی ہوا کہ وحی آ گئی اور آپؐ نے وہ لقمہ پھینک دیا، لیکن اس گوشت میں اتنا طاقتور زہر تھا کہ صرف مس ہونے سے ہی آپؐ پر اس کا اثر تا حیات باقی رہا۔

یہ بدبخت قوم مدینہ کے اطراف میں دنیا کے مختلف گوشوں سے آ کر بسی تھی، کیونکہ ان کے علم میں تھا کہ نبی آخر الزماںؐ اسی علاقے میں ظاہر ہوں گے۔ لیکن ان کی بدبختی کا کیا کہیے کہ وہ جناب رسول کریم ﷺ کو پا کر بھی آپؐ سے فیضیاب نہ ہو سکے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ آل یعقوبؑ میں سے نہ تھے، جن میں سے تمام نبی آئے۔ حالانکہ جناب یعقوبؑ اور ان کی اولاد اور عالیجناب محمد رسول اللہ ﷺ یہ سب کے سب ابو الانبیاء جناب ابراہیمؑ کی اولاد میں سے تھے۔ لیکن پھر بھی ذلیل یہود نے جناب رسالتمآبؐ کی نبوت قبول نہ کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو ٹھکرا دیا اور اپنے لیے بدبختی کو دعوت دی۔

یہود کے مقابلے میں ذلیل نصاریٰ جناب رسول کریم ﷺ سے بغض نہ رکھتے تھے۔ اور بیشتر نصاریٰ نے دین محمدی کو قبول بھی کیا۔ اسی لیے ذلیل نصاریٰ کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ (۵) آیت (۸۳) میں فرمایا ہے کہ:

''اور جب وہ رسول کی طرف نازل کردہ (کلام) کو سنتے ہیں تو آپ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، پس تو ہم کو بھی ان لوگوں کے ساتھ لکھ لے جو تصدیق کرتے ہیں (جناب رسول اللہؐ کی)''۔ (۸۳)

''اور ہمارے پاس کون سا عذر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر، اور جو حق ہم کو پہنچا ہے اس پر ایمان نہ لائیں۔ اور ہم اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک لوگوں کی رفاقت میں داخل کرے گا''۔ (۸۴)

۵۔قرآن پر ایمان

جیسا کہ گزشتہ ابواب میں بتایا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کو اس کی عقل و دانش کے علاوہ الہامی علم بھی عطا کیا، تاکہ وہ طاغوتی طاقتوں کا شکار ہوکر اللہ تعالیٰ کے نافرمان بندے نہ بن جائیں۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کی تعلیم کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب پیغمبر بھیجے اور کئی انبیاء کے پاس اپنی طرف سے الہامی کتب بھی بھیجیں تاکہ اولاد آدم کی روحانی تربیت ہو سکے۔ اس لیے کہ روز قیامت وہ یہ شکایت نہ کرسکیں کہ انہیں تو طاغوتی شر کے متعلق علم ہی نہ تھا۔

انسان کی تعلیم و تربیت ان کے زمانے کے مطابق کی جاتی رہی، لیکن آخرکار جب انسانی عقل و دانش عروج پر پہنچنے والی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اُسی اعتبار سے اپنا نمائندہ نبی کامل جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو اس انداز میں بھیجا کہ ان کی تربیت کا کمال اور ان کی لائی ہوئی کتاب "قرآن" رہتی دنیا تک اولاد آدم کی رہبری کرتی رہے۔ اس لیے کہ اب تکمیل دین ہوچکی، آخری نبی اپنے باکمال علم و فضل کے ساتھ آگئے، ان کے بتائے ہوئے قوانین اور ان کو دی ہوئی کتاب قیامت تک کے لیے ہمارے لیے رہنمائی کے لیے آخری کتاب ہوگی۔

لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے آخری استاد محترم جناب نبی آخر الزماں ﷺ اور آخری کتاب نصاب بھیج دیئے اور اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا قانون اولاد آدم کے لیے کامل کر دیا۔ اس لیے قیامت تک کے لیے راہ حق کے متلاشی قرآن الحکیم سے اور جناب محمد ﷺ کی حیات مبارکہ سے اور آپؐ کے اقوال مبارکہ سے استفادہ حاصل کرتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ہدایت القرآن الحکیم کی سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۲) میں فرمایا:

"یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں اور یہ ہدایت ہے ان لوگوں کے لیے جو پرہیزگاری اختیار کیے ہوئے ہوں گے (اپنی بصیرت کے مطابق)"۔

پچھلے ابواب میں یہ آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دین فطرت پر پیدا کیا، پھر ان

کے ماں باپ نے جو چاہا انہیں بنا دیا۔ چنانچہ ہر انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنی فطرت کے مطابق اچھائی اور برائی سے آگاہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ کسی کے مال کھا حق کھانے کو برا سمجھتا ہے، کسی کی مدد کرنے کو اچھا سمجھتا ہے۔ دھوکا دینے، کم تولنے، جھوٹ بولنے کو برا سمجھتا ہے۔ ظلم کو برا سمجھتا ہے اور ان اعمال کے برعکس اعمال کو اچھا جانتا ہے۔

اس لیے ایسے لوگ جو دین فطرت پر قائم ہوتے ہیں، وہ جب قرآن الحکیم سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو قرآن ان کی سمجھ میں آجاتا ہے اور ان کے لیے راہ ہدایت بن جاتا ہے۔

متذکرہ بالا آیت میں قرآن کے بارے میں جو کہا گیا ہے کہ "جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کی سچائی میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی کلام ہے جو اس نے ہماری ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔

سورۃ آل عمران (۳) آیت (۳۔۴) میں فرمایا گیا:

"جس نے نازل کیا تمہارے اوپر اس کتاب (قرآن) کو حق کے ساتھ، جو تصدیق کرتی ہے اپنے سے پہلے آنے والی کتابوں کی۔ جبکہ اس سے پہلے توریت اور انجیل کو اُتارا تھا"۔ (۳)

"اس سے پہلے لوگوں کو ہدایت کرنے والی بنا کر (نازل فرمایا اللہ نے توریت اور انجیل کو) اور قرآن بھی اُسی (اللہ) نے نازل کیا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے، بدلہ لینے والا ہے"۔ (۴)

فرمایا گیا سورۃ الاعراف (۷) کی آیت (۲) میں کہ:

"یہ ایک کتاب ہے (قرآن) جو تمہارے پاس (یعنی رسول کے پاس) اس لیے بھیجی گئی کہ تم اس کے ذریعے ڈراؤ۔ سو تمہارے دل میں اس کے بارے میں بالکل تنگی نہ ہو، اور یہ نصیحت ہے ایمان والوں کے لیے"۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی آخر الزماں ﷺ سے فرمایا ہے کہ: چونکہ قرآن الحکیم میں کفار کے متعلق شدید قسم کی وعید بیان کی گئی ہے، جو کافروں کو یقیناً بری لگے گی اور اس کی وجہ سے وہ یقیناً آپ کی مخالفت کریں گے۔ اس لیے آپؐ ان سے کسی قسم کا خوف محسوس نہ کرنا۔ بس آپؐ تو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا پیغام ان کے سامنے واضح کر کے بیان کر دیں۔ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں گے وہ ضرور اسے قبول کر لیں گے۔ اور جن کے

دل سیاہ ہو چکے ہیں کفر کے سبب وہ اس کی مخالفت کریں گے۔

سورۃ یونس (۱۰) آیت (۵۷) میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو بتا دیا ہے کہ یہ کتاب تمہارے واسطے ایک بہت بڑی نصیحت رکھتی ہے۔ اور تمہارے دل کی بیماری (کفر) کو دھونے کے لیے اکسیر ہے۔ اور اولاد آدم کے لیے کامل رہنمائی ہے قیامت تک کے لیے"۔ لیکن امت مسلمہ کی بدبختی کہ قرآن کو محض رسم ورواج کے لیے مخصوص کر لیا گیا ہے اور اس کی تلاوت کی جاتی ہے محض ثواب حاصل کرنے کے لیے، بغیر اسے سمجھے ہوئے۔ اس کے تعویذ بنائے جاتے ہیں اور اس پر قسمیں اٹھائی جاتی ہیں، نکاح کے بعد دلہن کو اس کے سائے تلے رخصت کیا جاتا ہے، اپنے عزیز واقربا کی موت پر اس کی تلاوت کی جاتی ہے بغیر سمجھے صرف ایصال ثواب کے لیے۔

اگر آپ غور فرمائیں تو یہ تمام رسوم قرآن الحکیم کی بے حرمتی کے اسباب میں سے ہیں۔ اور سب سے بڑی بدبختی اور گناہ کبیرہ کی بات یہ کہ کچھ لوگ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی جائداد ہڑپ کرنے کی غرض سے ان کا نکاح اس پاکیزہ کتاب سے کر دیتے ہیں اور اُن سے ان کی زندگی گزارنے کا حق چھین لیتے ہیں۔ یہ قرآن الحکیم کی توہین کبیر ہے۔

حالانکہ قرآن الحکیم اللہ تعالیٰ کا پاک کلام ہے جو تمام انسانوں کے لیے راہ ہدایت بتاتا ہے۔ اس لیے ہمارے لیے یہ واجب ہے کہ قرآن کا مطالعہ اس طرح سے کیا جائے جیسے کہ ایک طالب علم فزکس یا کیمسٹری کی کتابوں کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ قرآن الحکیم انسانوں کے لیے زندگی گزارنے کا ایک پورا نصاب مہیا کرتا ہے، لہٰذا اس کا مطالعہ نصابی کتب سے بھی زیادہ غور سے کرنا چاہیے۔

اب آیت مذکورہ بالا کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے۔ اور دلوں میں جو روگ ہیں (جہالت اور کفر کے) ان کے لیے شفاء ہے اور راہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے"۔ (۱۰:۵۷)

اسی مضمون سے متعلق ایک اور آیت ہے سورۃ بنی اسرائیل (۱۷) کی (۸۲) میں فرمایا گیا کہ:

"یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں، مومنوں کے لیے تو سراسر شفاء اور رحمت ہے، ہاں! ظالموں کو بجز نقصان کے کوئی فائدہ نہیں ہوتا"۔

پھر اسی مضمون پر سورۃ ابراہیم (۱۴) کی پہلی آیت بیان کرتی ہے:

"الر! یہ عالی شان کتاب ہم نے آپ کی طرف اُتاری (اے محمدؐ!) کہ آپؐ لوگوں کو اندھیروں کی طرف سے اُجالے کی طرف لے آئیں۔ ان کے پروردگار کے حکم سے یعنی زبردست اور تعریفوں والے اللہ کی طرف سے"۔

پھر وہی مضمون بیان ہوا سورۃ الحدید (۵۷) کی آیت (۹) میں، فرمایا گیا:

"وہ (اللہ) ہی ہے جو نازل کرتا ہے اپنے بندے پر واضح آیات تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے نور کی طرف لے جائے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نرمی کرنے والا، رحم کرنے والا ہے"۔

اندھیروں سے نور کی طرف لے جانے کا مطلب نہایت واضح ہے۔ اندھیرے کفر کی تعبیر جبکہ نور ایمان کی تعبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے نور سے مستفید ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کی عزت والی زندگی حاصل کر لے۔ بصورت دیگر ذلت بھری دردناک زندگی منتظر ہے کافروں کے لیے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو الفرقان کے نام سے بھی مخاطب فرمایا ہے۔ اس لیے کہ یہ کتاب کفر اور ایمان ۔۔۔ سچ اور جھوٹ ۔۔۔ کے درمیان فرق کرتی ہے۔ یعنی توحید اور شرک ۔۔۔ اچھائی اور برائی ۔۔۔ حق اور باطل ۔۔۔ عدل اور ظلم کے درمیان واضح فرق بیان کرتی ہے۔

اس سلسلے میں ملاحظہ ہو سورۃ الفرقان (۲۵) آیت (۱):

"بہت برکت والا ہے اللہ، جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا تاکہ وہ تمام لوگوں کے واسطے آگاہ کرنے والا بن جائے"۔

یعنی قرآن حضرت نبی آخری الزماں ﷺ کے وقت سے لے کر دنیا کے آخری وقت تک تمام دنیا کے لوگوں کے واسطے ہدایت کامل کی آگاہی کے لیے موجود رہے گا۔ اب جس کا جی چاہے وہ اس سے ہدایت حاصل کر لے اور کامیابی وکامرانی کا راستہ اختیار کر لے۔ بصورت دیگر گمراہی اور ذلت اس کا مقدر بن جائے گی۔

جب اللہ تعالیٰ نے قرآن الحکیم کو انسانوں کے لیے قیامت تک کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنا دیا تو پھر اس بات کا ذمہ بھی خود لے لیا کہ اس کلام اللہ میں کسی قسم کی تبدیلی یا الفاظ کا ردوبدل نہ ہونے پائے۔ اور یہ کتاب قیامت تک کے لیے اپنی اصلی حالت الفاظ ومضمون

کے اعتبار سے رہے۔ کیونکہ پہلی الہامی کتابوں میں نہ صرف الفاظ بلکہ مضمون ہی بدل ڈالے بلکہ تورات اور انجیل تو اپنی اصلی حالت میں موجود ہی نہیں ہیں۔ ان الہامی کتابوں کے خودساختہ تراجم مقامی زبانوں میں ملتے ہیں۔ اور انہیں کتابوں کو اصلی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کو یہ علم تک نہیں کہ یہ کتابیں کس زبان میں نازل کی گئی تھیں۔ اس طرح سے ان کتابوں میں بیان کردہ قوانین اور اہم باتیں تبدیل ہو گئیں۔ مثلاً یہود اور نصاریٰ کے لیے روزانہ تین نمازیں فرض تھیں اور ایک سال میں چالیس روزے۔ آج ان باتوں کا ان کے ہاں تصور تک نہیں ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن الحکیم میں سورۃ الحجر (۱۵) آیت (۹) میں فرمایا کہ:

”ہم نے اس قرآن کو نازل فرمایا ہے، اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں“۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے فرمایا کہ وہ ہدایت کی آگہی کے لیے جلدی کریں، کیونکہ موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔ یہ نہ ہو کہ آج کل کرتے کرتے وقت گزر جائے اور پھر موت اس کی مہلت نہ دے۔ اس بابت سورۃ الزمر (۳۹) آیت (۵۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

”اور پیروی کرو اس بہترین چیز کی جو تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے، اور تمہیں خبر بھی نہ ہو“۔

پھر بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب ان لوگوں کے واسطے باعث رحمت ہے کہ انہیں دانش اور بصیرت عطا کرتی ہے۔ سورہ الجاثیہ (۴۵) آیت (۲۰) میں فرمایا گیا ہے کہ:

”یہ (قرآن) لوگوں کے لیے بصیرت ہے اور ہدایت اور رحمت۔ اس قوم کے لیے جو یقین رکھتی ہے“۔

یعنی قرآن کی بصیرت اور دانش سے بھرپور واقعات۔ نادان اقوام کے قصے۔ ان کی جہالت اور پھر ہدایات۔ یہ سب کچھ ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر، اس کے رسولؐ پر اور اس کی کتاب پر۔ ورنہ غیر ایمان والوں کے لیے اس میں کچھ نہیں۔

۶۔ اللہ کے رسولوں پر ایمان

جب ہم الہامی کتابوں پر ایمان لے آئے کہ وہ اللہ کی طرف سے الہام شدہ کتابیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً اپنے انبیاء اور رسل پر بھیجی ہیں تو پھر ہمارا ایمان اللہ تعالیٰ کے منتخب کردہ انبیاء اور رسل پر خود بخود ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے سوا کسی دوسرے شخص پر الہام نہیں فرمایا، سوائے چند کے۔ مثلاً قرآن الحکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے الہام فرمایا شہد کی مکھی کو۔ اللہ تعالیٰ نے الہام فرمایا بی بی مریم کو۔ ہو سکتا ہے کہ کئی اور غیر انبیاء کو بھی الہام فرمایا ہو۔ لیکن ایک عام قانون کے مطابق الہام انبیاء اور رسولوں پر ہی کیا گیا۔

لیکن جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں کے الہام کا ذکر فرمایا ہے وہاں یہ بھی بتا دیا کہ وہ کس نبی یا پیغمبر پر نازل ہوئیں۔ یہ الہام کا سلسلہ ہمارے جد امجد جناب آدمؑ سے شروع ہوا۔ اس لیے کہ ہدایت کا سلسلہ آدمؑ اور آپ کی اولاد کے واسطے اسی وقت شروع کر دیا گیا تھا جب جناب آدمؑ اور حواؑ کو زمین پر آزمائش کی غرض سے اتارا گیا۔ کیونکہ ان کے زمین پر اترنے سے پہلے ہی ابلیس نے اپنی شرانگیز چالیں ان کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دی تھیں، اور اس کا یہ سلسلہ رہتی دنیا تک رہنا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کی آگہی کے لیے رہتی دنیا تک مکمل انتظام کر دیا ہے۔ چنانچہ ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کی راہبری کے واسطے اپنے پیغمبر بھیجے۔ سورۃ الشوریٰ (۴۲) آیت (۱۳) میں فرمایا گیا کہ:

”اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کر دیا ہے، جس کے قائم کرنے کا حکم نوحؑ کو دیا گیا تھا۔ اور وہ جو ہم نے تم پر (اے محمدؐ) نازل کیا اور جس کا حکم دیا ابراہیمؑ کو موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو اور کہا گیا تھا کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔ جس چیز کی طرف آپؐ انہیں بلا رہے ہیں، وہ مشرکین پر گراں گزرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنا برگزیدہ بنا لیتا ہے اور جو بھی اس کی طرف رجوع کرے وہ اس کی صحیح رہنمائی کرتا ہے“۔

جب کفار مکہ اور یہود مدینہ جناب نبی کریم ﷺ کے خلاف ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں بلکہ تیسرے گروہ انصار مدینہ کی طرف متوجہ ہو کر ان کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی کہ یہ نبی محترم ﷺ کوئی نیا دین تو نہیں لے کر آئے۔ یہ وہی باتیں تو کر رہے ہیں جو پچھلے انبیاء کیا کرتے تھے تو پھر تم لوگوں کو عقل کیوں نہیں آتی اور تم ان کی بات کیوں نہیں مانتے۔ اس سلسلے میں سورۃ البقرہ (۲) آیت (۲۱۳) میں فرمایا کہ:

"دراصل لوگ ایک ہی گروہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو خوشخبریاں دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ اور ان کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں تاکہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ ہو جائے"۔

اللہ تعالیٰ نے تو انسانوں کو دین فطرت کے ساتھ بھیجا، لیکن وہ ابلیس کے شر کی وجہ سے آپس میں اختلافات کرنے لگے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ان کے پاس انبیا بھیجے، تاکہ وہ ان کی تربیت کریں کہ وہ ابلیس کے شر سے بچ کر اللہ تعالیٰ کے تابعدار بندے بن جائیں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان انبیا کے ذریعے اپنی کتابیں بھجوائیں اور ان میں اس دور کے اعتبار سے لوگوں کے لیے قوانین بھیجے تاکہ وہ ان کے مطابق زندگی گزاریں اور دنیا میں سرخرو ہو جائیں۔ مزید یہ کہ وہ ان قوانین کے مطابق آپس میں اختلافات کو مٹانے کے لیے حق کے ساتھ فیصلے کریں۔

سورۃ النساء (۴) آیت (۱۶۳) میں انبیا کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

"یقیناً ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جیسے کہ نوحؑ اور ان کے بعد والے انبیا کی طرف بھیجی۔ اور ہم نے وحی کی ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور یعقوبؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف۔ اور ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا فرمائی"۔ (۱۶۳)

"اور بیان کیے بہت سے رسولوں کے واقعات ہم نے آپؐ سے، اور بہت سے رسولوں کے نہیں بھی کیے۔ اور موسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر کلام فرمایا"۔ (۱۶۴)

"ہم نے انہیں رسول بنایا، خوشخبریاں سنانے والے اور آگاہ کرنے والے بنا کر رسولوں کے بھیجنے کے بعد لوگوں کی کوئی حجت یا الزام اللہ تعالیٰ پر نہ رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ بڑا غالب اور بڑا حکمت والا ہے"۔ (۱۶۵)

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں میں بھی رسول بنائے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام زمین پر اللہ تعالیٰ کے انبیا کو منتقل کریں، جو کہ انسانوں میں سے منتخب کیے گئے تھے۔ اس بارے میں سورۃ الحج (۲۲) آیت (۷۵) میں فرمایا گیا:

"فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے پیغام پہنچانے والوں کو اللہ تعالیٰ ہی منتخب کرتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے"۔

سورۃ البقرہ (۲) آیت (۲۵۳) کے شروع میں فرمایا ہے:

"یہ رسول ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی"۔

فضیلت میں بہت سی باتیں آتی ہیں ایک تو یہ کہ رسالت کے ساتھ کتاب جن کو عطا ہوئی، ظاہر ہے کہ وہ فضیلت والے ہیں۔ کسی نبی کو کسی دوسرے کا نائب بنایا، بعض نبی ایک مقررہ جگہ کے لیے آئے، بعض ایک قوم پر اور یہ بھی کہ رسالت مآب پوری دنیا کے لیے مبعوث ہوئے اور آپؐ کی رسالت قیامت تک رہے گی۔ بعض سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا وغیرہ وغیرہ۔

یہی بات جو آیت مذکورہ میں کہی گئی دوبارہ سورہ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت (۵۵) میں دہرائی گئی۔ یعنی فرمایا کہ:

"اور تمہارا رب بہتر جانتا ہے جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں۔ اور بے شک! ہم نے فضیلت دی کچھ پیغمبروں کو دوسروں پر۔ اور داؤدؑ کو ہم نے عطا کی زبور"۔ (۱۷:۵۵)

انبیا اور رسولوں کی بابت ان کے امتیوں نے محبت میں آ کر مبالغے سے تحریف کی اور انہیں انسانوں کے سوا کوئی اعلیٰ مخلوق بنا کر پیش کیا جو قرآن کی اس کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان (۲۵) آیت (۲۰) میں فرمایا:

"ہم نے تم سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے وہ سب کے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے"۔

پھر سورۃ الحدید (۵۷) آیات (۲۵ تا ۲۷) میں فرمایا:

"یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل فرمایا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں"۔ (۲۵)

اس آیتِ مبارکہ میں میزان کا مطلب ہے عدل کے اور انصاف کے قوانین۔

میزان سے اکثر لوگ ترازو کا مطلب نکالتے ہیں۔ لیکن لفظ میزان ترازو سے بڑھ کر ایک بڑی بات کا عندیہ دیتا ہے۔ لیکن ترازو کا معنی اس میں شامل ہے۔

میزان کا ایک مطلب ہے Balance یعنی برابری، اعتدال وغیرہ۔ اور اس کا دوسرا مطلب ہے، ایک ایسا ذریعہ نظام اور قوانین، جس سے معاشرے میں عدل اور اعتدال قائم کیا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ہر ایک مخلوق میں Balance رکھا یعنی ہر شے کو میزان پر قائم کیا اور نظامِ میزان کا ایک حصہ بنایا۔ مثال کے طور پر نظامِ شمسی اور دیگر تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے میزان پر قائم رکھا۔ اگر ان کا میزان یا Balance نہ رہے تو یہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اسی کے متوازی دوسرا نظام معاشرے کے نظام کا ہے کہ اگر معاشرے کا نظام عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ معاشرہ تباہی کو دعوت دیتا ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا اور اپنی کتابوں کا نزول فرمایا تاکہ انسانی معاشرہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی میں اور اپنے معاشرے میں توازن پیدا کریں تاکہ زندگی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بسر کر سکیں۔

"بے شک ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا (پیغمبر بنا کر) اور ہم نے ان دونوں کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب جاری رکھی۔ تو ان میں سے کچھ ہدایت یافتہ ہوئے اور کچھ نافرمان"۔ (۲۶)

"ان کے بعد پھر بھی ہم رسولوں کو پے در پے بھیجتے رہے"۔ (۲۷)

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں سے اور ان سے جنہوں نے انبیا کی تکذیب کی ہوگی، یہ سوال کریں گے کہ کیا تمہارے پاس میرا پیغام پہنچانے کے لیے پیغمبر آئے تھے؟ تو وہ اس بات کی تصدیق کریں گے۔ اور اسی طرح سے ان انبیا سے بھی پوچھا جائے گا (حجت قائم کرنے کے لیے) کہ کیا تم نے میرا پیغام اپنی امتوں کو پہنچایا تھا تو وہ بھی ہاں میں جواب دیں گے۔

اس سلسلے میں سورۃ الاعراف (۷) کی آیت (۶) میں فرمایا گیا:

"پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے، جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے، اور ہم پیغمبروں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے"۔

قرآن الحکیم میں اس بات کی وضاحت اس لیے کی گئی ہے، کیونکہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو سزا سنانے سے پہلے ان کے خلاف پر حجت قائم کریں گے کہ ان کے پاس اللہ کے پیغمبر تو آئے تھے لیکن انہوں نے ان کی نافرمانی کی۔

اس لیے آج کے مسلمان کو اس بات کو غور سے سُن لینا چاہیے کہ وہ کس کس طرح سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانیاں کر رہے ہیں۔ جبکہ ان کی ہدایت کے واسطے اللہ کی کتاب اور جناب رسول اللہؐ کی سیرتِ مبارکہ اور اقوال بآسانی دستیاب ہیں۔ اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکامات نہیں مانتے۔ پھر یہ کیا جواب دیں گے اللہ تعالیٰ کے حضور، قیامت کے روز۔

آج بھی وہی دین ہے جس کا پیغام جناب نوحؑ نے اور جناب ابراہیم خلیلؑ نے دیا تھا۔ قرآن نے ہمیں یہ پیغام بھی دے دیا ہے کہ تمہارے واسطے کوئی نیا دین نہیں آیا بلکہ وہی دین مقرر کیا گیا ہے جسے قائم کرنے کا حکم ساتھ انبیا کے ذریعہ دیا گیا تھا۔

سورۃ الشوریٰ (۴۲) آیت (۱۳) میں بیان ہے کہ:

"اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جسے قائم کرنے کا حکم نوحؑ کو دیا تھا، اور وہی (دین) ہم نے تمہاری طرف بھیجا، اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا تھا، کہ اس دین کو قائم رکھنا"۔

قرآن الحکیم میں چند چیدہ چیدہ اور جناب رسول کریمؐ سے قریب تر زمانے کے انبیا کا ذکر کیا گیا ہے، وہ گنتی کے اعتبار سے چند ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا بھیجے تاکہ وہ ابلیس کے شر سے بچ سکیں اور اللہ تعالیٰ کے تابعدار بندے بن کر زندگی گزاریں۔

ہمارے لیے یہ جاننا ضروری نہیں کہ کل کتنے انبیا اور رسل آئے۔ بلکہ ہمارا ایمان یہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی پیغمبر مبعوث فرمائے تھے وہ برحق تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولادِ آدم کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے اور آخر کار نبوت کے ادارے کو جناب محمدﷺ پر کامل کر کے مہر بند کر دیا اور آپؐ کی رسالت قیامت تک کے آنے والوں کے لیے مقرر کر دی۔

۷۔ نبیٔ کامل آخر الزماں عالیجناب محمدؐ پر ایمان

یہ بات ہمیں اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہم مسلمان کہلانے کے باوجود اس وقت تک مسلمان نہیں بن سکتے جب تک کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی اطاعت نہ کریں گے۔ عالی جناب محمد ﷺ پر ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم نے ان کی اطاعت کا وعدہ اپنے دل سے کر لیا ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت انسان میں تقویٰ پیدا کرتی ہے اور تقویٰ کا مطلب ہے کہ انسان اپنے نفس کے گھوڑے کو تقویٰ کی لگام ڈال کر اس راستے پر چلائے جو راستہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے انسانوں کے لیے مقرر کیا ہے۔

تقویٰ کی لگام طاغوتی راستوں سے ہٹتی بچتی راہِ ہدایت اختیار کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ زیادہ تر مسلمان کہلانے والے لوگ تقویٰ اختیار ہی نہیں کرتے، اس لیے وہ راہِ ہدایت پانے میں ناکام ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کا نفس انہیں طاغوتی راستوں پر چل نکلتا ہے۔ اور پھر ان کا نفس ان کے بدترین دشمن ابلیس کے شکنجے میں آ جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اولادِ آدم سے بہت زیادہ محبت فرماتے ہیں اور انسانوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش میں اس کے لیے ہدایت کا بندوبست فرماتے رہے ہیں۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ انسانوں کی تربیت کے لیے انبیا کو ہر دور میں مبعوث فرمایا۔ یہاں تک کہ انسانی تہذیب و تمدن کی انتہائی منزل آنے سے قبل ہی اس کی تعلیم ہدایت کو بھی کامل درجہ عطا کر دیا اور ایسے قوانین وضع کر دیے جو اس کے لیے قیامت تک کے لیے مکمل راہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی نبوت کو بھی کامل کر دیا اور ایسا نبی مبعوث کر دیا جس کا کردار اور اعمال اور دانش و حکمت رہتی دنیا تک انسان کے لیے نمونۂ ہدایت رہیں گے۔ اس لیے روزِ حساب کوئی شخص بھی یہ نہ کہہ سکے گا کہ وہ ہدایت کے متعلق لاعلم تھا۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ

یونس (۱۰) کی آیت (۱۰۸) میں فرمایا کہ:

"کہو (اے محمدؐ) اے لوگو! اب حق تمہارے سامنے آ گیا ہے، تمہارے رب کی طرف سے، پس جو کوئی بھی ہدایت وصول کرے گا، وہ اپنے لیے ہی بھلائی کرے گا اور جو کوئی بھی اس سے دور رہے گا اس کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ اور میں (رسول اللہؐ) تمہارے لیے کوئی ذمہ دار نہیں بنایا گیا (یعنی میرا کام تو فقط تمہیں آگاہ کرنا ہے)"۔

سورۃ الفتح (۴۸) آیت (۱۳) میں اللہ تعالیٰ نے جناب محمدؐ پر ایمان نہ لانے والے کو آگ کے عذاب کی وعید سنائی ہے۔ فرمایا:

"اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے تو ہم نے بھی ایسے کافروں کے لیے دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے"۔

سورۃ الفتح (۴۸) کی آیت (۲۸) میں فرمایا:

"وہی ہے (یعنی اللہ) جس نے اپنے رسول (محمدؐ) کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے ہر دین پر غالب کرے، اور اللہ تعالیٰ کافی ہے گواہی دینے والا"۔

پھر اس سے اگلی آیت (۲۹) میں واضح طور پر بتا دیا کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور ان کے پیروکاروں کی نشانیاں بھی بتا دیں تاکہ ان کی پہچان ہو سکے۔ فرمایا:

(آیت کا پہلا حصہ) "محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں (وہ) کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں رحم دل۔ تُو انہیں دیکھے گا کہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں، ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے"۔

پھر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف (۷) آیت (۱۵۷) میں عالیجناب رسول کریم ﷺ کے صحابہ کے اوصاف بتائے ہیں۔ فرمایا کہ:

"جو لوگ ایسے رسول اور نبی اُن پڑھ کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ ان کو نیک باتوں کا حکم دیتے اور بُری باتوں سے منع کرتے ہیں۔ اور پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں اور گندی کو حرام۔ ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں۔ سو جو لوگ اِن نبیؐ پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت

کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور (قرآن) کا اتباع کرتے ہیں، جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے یعنی قرآن۔ ایسے ہی لوگ ہیں فلاح پانے والے"۔

عالمی جناب رسول کریم ﷺ کے اعلان نبوت کے بعد سابقہ انبیا کی امتوں یعنی یہود اور نصاریٰ پر واجب ہو گیا کہ وہ آپؐ کی رسالت پر ایمان لے آئیں، کیونکہ ان کی الہامی کتابیں جناب نبی کریمؐ کی نبوت کا علم واضح طور پر بتاتی تھیں اور اس وجہ سے کئی متقدر عیسائی آپؐ پر ایمان بھی لے آئے اور کئی اصحاب نے آپؐ کے اعلان نبوت سے پہلے ہی آپؐ کو نبی تسلیم کر لیا تھا۔ مثلاً جناب ورقہ بن نوفلؓ، بحیرہؓ اور حبشہ کے بادشاہ جناب نجاشیؓ۔ لیکن چند یہود نے اسلام قبول کیا اور زیادہ تر نے انکار کر دیا۔

دینِ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے کامل کر دیا، اس طرح سے کہ اس کے بعد اور کسی دین کے آنے کی گنجائش باقی نہ رہی اور نبی کامل جناب محمد ﷺ پر نبوت اپنے کمال اور اختتام پر پہنچ گئی۔ شریعتِ اسلامیہ کے آنے کے بعد گزشتہ تمام ادیان کے قوانین سلب ہو گئے۔ ایک خاص بات یہ کہ دینِ اسلام میں پہلے ادیان کے مقابلے میں کچھ آسانیاں بھی دے دی گئیں۔ مثلاً یہود و نصاریٰ کی شریعت میں روزے چالیس روز کے لیے تھے اور اس میں سحری نہ تھی بلکہ ایک ہی کھانا تھا اور پھر رات سونے کے بعد روزہ شروع ہو جاتا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں شریعتِ محمدی میں روزہ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک کر دیا گیا اور ان کی تعداد چالیس کے مقابلے میں تیس کر دی گئی۔

پھر سورۃ الاعراف کی آیت (۱۵۸) میں فرمایا کہ:

"کہو (اے محمدؐ) اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی تمام زمین اور آسمانوں پر ہے۔ اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت۔ سو، اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی امی پر، جو اللہ اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا اتباع کرو تا کہ تم (صحیح) راہ پر آ جاؤ"۔

اس آیتِ شریفہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی مکرمؐ صرف اہلِ عرب کے لیے نہیں، پوری انسانیت کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں۔ بلکہ انسانوں کے علاوہ جنات بھی آپؐ

کی شریعت کے پابند ہیں۔

سورۃ آلِ عمران (۳) آیت (۱۶۴) میں بتلایا گیا ہے کہ یہ نبی کامل پوری انسانیت کے لیے احسان ہیں۔ فرمایا:

"بے شک اللہ کا احسان ہے ایمان والوں کے لیے کہ اس نے بھیجا ان میں سے ہی ایک رسول جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ بے شک یہ سب اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے"۔

آیت متذکرہ میں بتلایا گیا ہے کہ جناب محمد رسول اللہؐ لوگوں کو کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں۔ یہاں کتاب سے مراد تو قرآن ہے اور حکمت سے مراد وہ الہام ہے جو جناب نبی کریم ﷺ پر قرآن کے علاوہ نازل کیا جاتا تھا، جسے حدیثِ قدسی بھی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ عقل اور دانش کی باتیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو سکھائیں اور آپؐ کی فطرت میں داخل کر دیں، جس کی وجہ سے آپؐ کا بے مثال کردار اور اعمال ایک نمایاں حیثیت میں ظاہر ہوئے اور امتِ مسلمہ کے لیے اعلیٰ ترین مثال بن گئے۔ تا کہ لوگ آپؐ کی پیروی کریں اور راہِ حق پر گامزن ہو جائیں۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ القلم (۶۸) آیت (۴) میں فرمایا:

"بے شک (اے محمدؐ) آپ اخلاق کے بہترین درجہ پر فائز ہیں"۔

اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریمؐ کو انسانیت کے کامل درجہ پر فائز کرنے کے بعد آپؐ کو امت کے واسطے رحمت قرار دیا، کیونکہ آپؐ لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے راہِ راست دکھاتے اور مخلوق اللہ کو دوزخ کی آگ سے بچاتے اور تا قیامت آپؐ کا اسوۂ حسنہ باعثِ رحمت رہے گا۔

اس واسطے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیا (۲۱) آیت (۱۰۷) میں فرمایا:

"ہم نے بھیجا تمہیں (اے محمدؐ) عالمین کے لیے رحمت بنا کر"۔

اور اس بات کی تصدیق بھی کر دی کہ اگر آپؐ کا اخلاق ایسا نہ ہوتا اور آپ کی فطرت میں محبت، رحم اور تکلیف دہ باتوں سے درگزر کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو لوگ آپؐ سے دور رہتے۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ آلِ عمران (۳) آیت (۱۵۹) میں فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے ہی آپؐ ان کے ساتھ نرم خُو رہے اور اگر آپؐ ان سے تلخ مزاجی سے پیش آتے تو وہ آپؐ سے دور ہو جاتے"۔

لہٰذا دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جناب نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں۔ خاص طور پر وہ جو مسلمان کہلاتے ہیں، اُن کا ایمان کامل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپؐ پر ایمان لا کر آپؐ کے احکامات کی تکمیل نہ کریں۔

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ نور (۲۴) آیت (۶۲) میں فرمایا کہ:

"مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں"۔

فرمایا سورۃ سبا (۳۴) آیت (۲۸) میں کہ:

"اور ہم نے بھیجا آپؐ کو خوشخبری دینا کر تمام انسانوں کے لیے۔ انہیں خوشخبری اور ڈر سنانے والا، لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے ہی نہیں"۔

فرمایا سورۃ محمد (۴۷) آیت (۳۳) میں کہ:

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی (اور اس بات سے منکر یا غافل ہو کر) اپنے اعمال کو غارت نہ کرو"۔

فرمایا سورۃ آل عمران (۳) آیت (۳۱-۳۲) میں کہ:

"کہو (اے محمدؐ)! اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا، اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔ بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔ (۳۱)

"کہو (اے محمدؐ)! اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی، پھر جو کوئی پھر جائے تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا"۔ (۳۲)

اطاعتِ رسول اللہؐ کے ساتھ یہ بھی ہمارے ایمان کا حصہ ہونا چاہیے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے متعلق کسی قسم کے غلو سے کام نہ لیں۔ یعنی آپؐ سے ایسی صفات کو منسوب نہ کیا جائے جو صرف اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ لیکن کچھ لوگ جوشِ محبتِ رسول اللہ ﷺ میں ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو شرک کی حد چھو لیتی ہیں۔ لہٰذا ایسی باتوں سے اجتناب کریں اور اس بات کو ذہن میں

رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کو ظلمِ عظیم قرار دیا ہے۔

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانعام (۶) آیت (۵۰) میں فرمایا کہ:

"کہو (اے محمدؐ)! میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزینے ہیں۔ اور نہ ہی میں غیب (کا علم) جانتا ہوں۔ اور نہ ہی میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ لیکن میں (تو صرف) وہ بات کہتا ہوں جو مجھے الہام کی جاتی ہے۔ کہو (اے محمدؐ) کیا اندھے اور بینا ایک جیسا رکھتے ہیں؟ تو پھر کیا تم غور نہیں کرو گے؟"۔

آیتِ متذکرہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ یہ رسول اللہؐ کی طاقت نہیں کہ وہ لوگوں کے کہنے پر زمین سے خزانے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں۔ اور نہ ہی وہ کسی قسم کا علمِ غیب رکھتے ہیں۔ وہ صرف وہی علم رکھتے ہیں جو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا جاتا ہے۔ اور غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی جانتی ہے۔

یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ غیب کا مطلب کیا ہے۔ انسان پر جو ساعت گزر جاتی ہے اور جس ساعت میں وہ گزر رہا ہے وہ باتیں یا واقعات یا مشاہدات اس کے علم میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن آئندہ آنے والی ساعت اور آئندہ آنے والے زمانے کے متعلق وہ کچھ نہیں جان سکتا، کیونکہ مستقبل اس سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ انسان کے لیے غیب ہوتا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے لیے پورے کا پورا زمانہ یا عہد اس کے سامنے ہوتا ہے۔ اس کی ذاتِ عالی شان زمان و مکان سے آزاد ہوتی ہے اور اس کا علم آنے والی باتوں پر بھی محیط ہوتا ہے۔ اور اس کی ذات کے لیے سب کچھ ظاہر ہوتا ہے اور اس کے لیے غیب نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس لیے نبیؐ کو جس بات کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا وہی آپؐ نے لوگوں تک پہنچا دیا۔

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم نبی کامل ﷺ کے احکامات اور اعمال و اقوال پر عمل پیرا ہو کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں۔ تاکہ ہماری دنیا اور آخرت میں خیر ہو۔ یہی نبی کامل پر ایمان لانے کے مترادف ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ۝

۸۔ روزِ قیامت پر ایمان

اس بات پر یقین رکھنا کہ ایک وقت ایسا آئے گا، جس کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی علم نہیں، کہ اس وقت یک لخت یہ دنیا اور اس کی ہر چیز تباہ کر دی جائے گی، اللہ کے حکم سے۔ اور پھر اس کے بعد تمام انسان یعنی آدم اور آپ کی تمام اولاد دوبارہ زندگی عطا کیے جائیں گے اور پھر سب کو اکٹھا کر کے مالکِ ارض و سماء کے حضور پیش کیا جائے گا۔ پھر رب ذوالجلال والاکرام کے حکم سے ان سب کو ان کے اعمال نامے دے دیے جائیں، یعنی وہ تمام اعمال جو انہوں نے اپنی زندگی میں کیے ہوں گے اور پھر ان سب کو ان کے اعمال کے مطابق سزا اور جزا سنائی جائے گی۔

روزِ قیامت پر ایمان لانے کا مقصد اور مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا دن وقوع پذیر ہوگا جس دن تمام انسانوں کے اعمال کا حساب لے کر اس کے مطابق جزا یا سزا دی جائے گی۔ لیکن صرف اس بات پر ایمان لانا یا یقین ہمارے لیے کچھ بھی فائدہ مند نہ ہوگا، بلکہ ایمان لانے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم اس روز کی تیاری کر لیں جو نہایت خوفناک ہوگا۔ اور اس طرح سے تیاری کریں کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حق دار ہو کر اس کے غضب اور عذاب سے بچ جائیں۔ اس واسطے ہمیں صرف اور صرف ایک کام کرنا ہوگا، وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات کے مطابق اپنی زندگی بسر کریں۔

اب ہم روزِ قیامت کی ہَولناکی کے متعلق قرآن حکیم کی آیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کر کے اپنے ایمان اور یقین کو تقویت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

سورۃ الحدید (۵۷) آیات (۱۲ تا ۱۵) میں فرمایا گیا کہ:

"اس روز تم دیکھو گے ایمان والے مَردوں اور ایمان والی عورتوں کو، ان کے آگے اور دائیں طرف روشنی ہوگی، (پس) خوشخبری ہے تمہارے لیے اس دن کہ باغات ہوں گے،

جس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، بے شک یہی بڑی کامیابی ہے"۔ (۱۲)

"اس روز جب منافقین، مرد اور عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے کہ ذرا ہمارے لیے انتظار تو کرو! (اور) ہمیں بھی اپنے نور (روشنی) میں سے کچھ فائدہ اٹھانے دو تو یہ کہا جائے گا کہ جاؤ اپنی پچھلی طرف اور روشنی حاصل کرو۔ پس ایک دیوار قائم کر دی جائے گی ان کے درمیان جس میں ایک دروازہ ہوگا، جس کے اندر تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی، جبکہ باہر عذاب"۔ (۱۳)

"(منافقین) پکاریں گے ایمان والوں کو! کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے، اس پر ایمان والے جواب دیں گے، ہاں! لیکن تم تو کھنچے چلے جاتے تھے برائیوں کی طرف اور چاہتے تھے ہماری بربادی۔ تم نے شک کیا (ایمان میں) اور تم دھوکے میں رہے اپنی جھوٹی خواہشات کی وجہ سے یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا (یعنی موت) پس سب سے بڑے دھوکہ دینے والے (ابلیس) نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دیا"۔ (۱۴)

"پس اس روز تم سے کسی قسم کا فدیہ نہ لیا جائے گا (اے منافقو) اور نہ ہی ان لوگوں سے جو ایمان نہ لائے۔ لہٰذا تمہارا ٹھکانہ تو آگ ہے اور وہی تمہارا مولا ہے، بے شک بدترین جگہ ہے وہ"۔ (۱۵)

دنیا میں ان لوگوں سے بھی گناہ ہوتے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے گناہوں سے شرمندہ ہوتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ کئی لوگوں سے بھول میں بھی گناہ سرزد ہو جاتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ مومن ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے روزِ قیامت نرمی اختیار کریں گے۔ جبکہ سورۃ البقرہ (۲) آیت (۲۸۴) میں فرمایا گیا کہ:

"اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں۔ (اپنے گناہوں کو) خواہ تم پوشیدہ رکھو یا ظاہر، وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور وہ اس کا حساب بھی لے گا، لیکن پھر وہ جسے چاہے گا معاف فرما دے گا، اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر کام

کرنے کی قدرت رکھتا ہے''۔

سورۃ الزلزلہ (۹۹) میں قیامت کے دن کا مکمل نقشہ کھینچ دیا گیا ہے، کہ قیامت کیسے آئے گی اور اس روز اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ کیا معاملہ فرمائیں گے۔ ان معاملات کی خبر ہمیں اس لیے دے دی گئی ہے تاکہ ہم اس دن کے لیے اپنی تیاری مکمل رکھیں۔ اور اپنے اعمال کو اللہ اور اس کے رسول کے تابع کر دیں۔ اس صورت میں ہمارا شمار اللہ تعالیٰ کے تابعدار بندوں میں ہو جائے گا اور پھر ہم روزِ قیامت کی بے سروسامانی، بے کسی، بے بسی اور لاچاری سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سایہ میں آ جائیں گے، ان شاء اللہ۔

اس سورۃ میں کل آٹھ آیات ہیں جن کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:

آیت (۱) اور (۲)۔

''جب زمین انتہائی خوف کے عالم میں تھرتھرائے گی اور آخری مرتبہ اپنے اندر کا بوجھ اُگل دے گی اور اس کے تمام دفینے باہر آ جائیں گے''۔

اس آخری جملے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ تمام مردہ انسان زندہ ہو کر باہر آ جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو جائیں گے اور اپنے اپنے انجام کے منتظر ہوں گے۔

اس صورتحال کے پیشِ نظر سورۃ الحج (۲۲) کی آیت (۱) میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں تنبیہ کی ہے کہ:

''اے انسان! اپنے رب سے ڈرو اور اس کے حقوق ادا کرو (یعنی اس کی تابعداری اختیار کرو) بے شک! وقتِ مقررہ کا زلزلہ بہت ہی خوفناک چیز ہے''۔

پھر اسی مضمون کے حوالے سے سورۃ الانشقاق (۸۴) کی آیت (۳) اور (۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اور جب زمین پھیلے گی اور سکڑ سے گی''۔ (۳)

''اور نکال دے گی جو کچھ بھی اس کے اندر ہو گا، اور خالی ہو جائے گی''۔ (۴)

صحیح مسلم میں عالیجناب رسول کریم ﷺ کا قولِ مبارک منقول ہے کہ:

''زمین پھینکے گی اپنے اندر سے اپنے جگر کے ٹکڑے۔ اور سونے اور چاندی کے ڈھیر

لگ جائیں گے۔ ایک قاتل پچھتاوے کے ساتھ کہے گا، کہ افسوس! میں نے قتل کا جرم کیا اس (زمین) پر، اور وہ یہاں پڑا ہے اور اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ اسی طرح سے وہ (شخص) جو توڑے گا اپنی رشتہ داری، کہے گا: کہ میں نے اس (دولت) کی محبت میں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ایک چور کہے گا: کہ اس (دولت) کی محبت میں میں نے اپنے ہاتھ سے جرم کیا اور دنیا کی دولت بکھری پڑی ہو گی اور اس کا کوئی مالک نہ ہو گا''۔

مطلب یہ کہ انسان جس دولت کی خاطر اپنی رشتہ داریاں چھوڑ دیتا ہے، دوسروں کو ذلیل کرتا ہے، حرام کے ذریعہ سے دولت کماتا ہے، دولت کی خاطر قتل کر دیتا ہے۔ وہ اس روز بے بس اور بے کس ہو کر اس دولت کے انبار کو دیکھے گا جس کی اس وقت کوئی قیمت نہ ہو گی اور نہ اس کا چاہنے والا ہو گا۔

الزلزلہ آیت (۳) تا (۵):

''تو پھر انسان کہے گا! اسے کیا ہوا؟ (زمین کو)''۔ (۳)

''تو پھر اس روز تمام معلومات سامنے آ جائیں گی (اچھائی اور برائی کے بارے میں)''۔ (۴)

''کیونکہ تمہارا رب سب کچھ ظاہر کر دے گا''۔ (۵)

روزِ قیامت انسان زمین کی تھرتھراہٹ اور گھن گرج پر تعجب کرے گا اور اس بات پر زیادہ تعجب کرے گا کہ جب وہ دیکھے گا مُردوں کو باہر پھینکتے ہوئے۔ اس وقت زمین اور آسمان یکسر تبدیل ہو جائیں گے اور پھر تمام کے تمام انسان اپنے رب ذوالجلال والاکرام کی حضوری میں حاضر ہو جائیں گے اور اس وقت زمین گواہی دے گی کہ فلاں فلاں لوگوں نے فلاں فلاں نافرمانی کے کام کیے۔

جب رسول کریم ﷺ نے سورۃ الزلزلہ کی تلاوت فرمائی تو پھر اپنے ساتھیوں سے پوچھا: ''کیا تم جانتے ہو کہ اس روز (قیامت) کی کیا خبر ہے''۔ انہوں نے کہا: ''اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں''۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ بتائے گی (زمین) کہ فلاں فلاں آدمی نے یہ کام کیا، فلاں فلاں جگہ اور فلاں فلاں وقت''۔ (مذکورہ ترمذی)

نسائی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ فرمایا جناب رسول کریم ﷺ نے کہ:

"زمین سے خبردار رہو، یہ تمہاری ماں ہے۔ اس کی سطح پر کوئی بھی اچھا یا برا کام ہوا ہوگا تو اسے یہ ظاہر کرے گی۔ یہ سب کچھ کرنے کے لیے اس کا رب اسے حکم دے گا"۔

اس فرمان مبارک کے متعلق ساساہ بن معاویہ نے کہا کہ "یہ میرے لیے کافی ہے۔ اگر میں اس سے زیادہ کچھ اور نہ سن سکوں اور مجھے اس کی اب ضرورت بھی نہیں"۔ (منقول احمد بن حنبل و نسائی)

اس کا مطلب تھا کہ جب زمین اس کی اچھائیاں اور برائیاں سب ظاہر کر دے گی تو پھر وہ کیوں نہ صرف اچھائیاں ہی کرے اور برائیوں کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دے۔ اس کی اچھائیاں اس کی بخشش کا ذریعہ بن جائیں۔

امام بخاری نے عدی بن حاتم سے روایت کیا ہے کہ فرمایا جناب رسول کریمؐ نے کہ:

"آگ سے ڈرو اور اسے بجھانے کی کوشش کرو، چاہے تم آدھی کھجور ہی صدقہ کر سکو"۔

مطلب یہ کہ ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ حسب استطاعت صدقہ کرتا رہے خواہ اس کی مقدار کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو کیونکہ صدقہ آگ سے بچائے گا۔

امام ابن کثیرؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ:

"کسی نیکی کے کام کو کبھی بھی کم حیثیت نہ جانو، چاہے وہ کسی کو پانی پلانا ہی کیوں نہ ہو یا کسی بھائی سے مسکرا کر ملنے کو"۔

ایک اور حدیث میں بیان ہوا ہے کہ فرمایا جناب رسول کریمؐ نے کہ:

"اے عورتو! کبھی بھی کسی پڑوسی کے بھیجے ہوئے تحفے کو حقیر نہ سمجھو، اگرچہ وہ ایک کھر (بکری کے پاؤں کا حصہ) ہی کیوں نہ ہو"۔

مزید ایک حدیث رسول کریم ﷺ میں فرمایا گیا ہے کہ:

"مانگنے والے فقیر کو کچھ نہ کچھ دے دیا کرو، خواہ وہ ایک جلا ہوا کھر ہی کیوں نہ ہو"۔

اس کا مطلب ہے کہ فقیر یا سائل کو کچھ نہ کچھ دینا چاہیے، بے شک وہ کھانے کی معمولی چیز ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ یہ ہدایت نبی کریمؐ کی ان لوگوں

کے لیے ہے جو خود مسکین ہوں۔ جبکہ صاحب حیثیت لوگوں کا دینا تو ضروری ہے۔ اور انہیں تو سائل کو نہ دینا بنتا ہی نہیں کیونکہ وہ ان کی بخالت کا ثبوت ہوگا۔

ایک قول سننے میں آیا ہے کہ مانگنے والا ہاتھ تو بے شک ذلیل ہوتا ہے لیکن اسے خالی لوٹانے والا ہاتھ اس مانگنے والے ہاتھ سے بھی زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ناشکری کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے نقل کیا ہے کہ جناب رسول کریم ﷺ نے ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا: "اے عائشہ! کسی بھی چھوٹے گناہ کو کم حیثیت نہ جانو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سب کا حساب لے گا"۔

ابن جریرؒ کی ایک روایت کے مطابق سورۃ الزلزلہ جناب ابوبکر صدیقؓ کے سامنے نازل ہوئی تھی۔ جبکہ وہ اس کو سن کر زار و قطار رو پڑے۔ جب رسول کریم ﷺ نے وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ اس سورۃ کو سن کر رو پڑا۔ تو جناب رسول کریمؐ نے فرمایا کہ "اگر تم نے غلطیاں نہ کی ہوتیں کہ اللہ تمہیں معاف فرماتا۔ تو اللہ ایسے لوگوں کو پیدا فرما دیتا کہ وہ غلطیاں کرتے اور اللہ انہیں معاف فرماتا"۔

اس حدیث شریف کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معاف کرنا بے حد پسند ہے۔ اس لیے ہمیں ہر دم اللہ تعالیٰ کے حضور دست بستہ معافی طلب کرتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ جناب رسول کریم ﷺ اللہ تعالیٰ سے ہر روز ستر (۷۰) مرتبہ معافی کے طلبگار رہتے تھے۔

ابن جریرؒ سے روایت ہے کہ جناب ابوبکرؓ، جناب رسول اللہؐ کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے تھے کہ سورۃ الزلزلہ کا نزول ہوا۔ تو انہوں نے کھانا چھوڑ دیا اور جناب رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ: "اے اللہ کے رسول! کیا مجھے سزا ملے گی اس گناہ کی جو چاہے ایک ذرے کے برابر ہی کیوں نہ ہو"۔ آپؐ نے فرمایا: "جو مصیبتیں اور تکالیف تم دنیا میں اٹھاتے ہو وہ ان کا کفارہ بن جاتی ہیں، لیکن تمہارے اچھے اعمال جمع کیے جاتے ہیں جن کا اجر تمہیں روز قیامت ملے گا"۔

ان آیات کو سن کر جناب ابوسعید خدریؓ نے جناب رسول کریمؐ سے عرض کیا: "کیا مجھے

اپنے ہر عمل کا خیال رکھنا پڑے گا؟'' جناب رسول اللہؐ نے فرمایا: ''ہاں''۔ انہوں نے پھر پوچھا ''کیا تمام بڑے گناہوں کا؟''۔ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں''۔ انہوں نے کہا: ''افسوس''۔ پھر جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''خوش ہو جاؤ ابوسعید! کہ نیک اعمال کا اجر اس گنا سے سات صد گنا تک ملے گا یا اس سے بھی زیادہ۔ اگر اللہ چاہے گا تو۔ لیکن تمام بداعمال کی سزا صرف ان کے برابر ہی ہوگی۔ یا اللہ چاہے گا تو معاف فرما دے گا''۔

پھر آپؐ نے فرمایا: ''کوئی شخص بھی اپنے اعمال کے سبب نہیں بخشا جائے گا''۔

ابوسعیدؓ نے پوچھا: کیا آپ بھی نہیں اے اللہ کے رسولؐ؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں! میں بھی نہیں۔ جب تک کہ اللہ اپنے رحم، فضل اور کرم سے نہ بخش دے''۔

سورۃ الزلزلہ آیت (۷) تا (۸)۔

سعید بن جبیرؒ سے روایت ہے کہ جب سورۃ الدھر (۷۶) کی آیت (۸) نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ: ''اور وہ دیتے ہیں کھانا، اس سے اپنی محبت کے باوجود غربا کو، یتامیٰ کو اور قیدیوں کو''۔

تو لوگوں نے سوچا کہ اگر وہ کوئی معمولی شے خیرات میں دیں گے تو اس کا کوئی وزن یعنی اہمیت نہ ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے فقراء سے منہ موڑنا شروع کر دیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ایک کھجور کی یا روٹی کے ایک ٹکڑے کی خیرات کی تو اوقات نہیں، ان کا خیال تھا کہ انہیں خیرات میں کوئی قیمتی چیز دینی چاہیے، اگر وہ دینے کے قابل ہوں تو۔ ان کے برعکس ایک دوسرا گروہ ایسا تھا جنہیں یہ گمان ہوا کہ ان کے حساب میں چھوٹے گناہ نہیں لکھے جائیں گے، جیسا کہ جھوٹ بولنا وغیرہ۔ چنانچہ انہوں نے سوچا کہ دوزخ کی وعید صرف بڑے گناہوں کے لیے ہے۔

لہٰذا اس غلط سوچ کو درست کرنے کے واسطے سورۃ الزلزلہ کی آیت (۷) تا (۸) کا نزول ہوا جس میں فرمایا گیا کہ:

''اس روز انسان بکھرے ہوئے گروہوں میں آئیں گے اور ان کے سامنے ان کے اعمال رکھے جائیں گے''۔ (۶)

''پس جو کوئی بھی اچھائی کرے گا، ایک ذرے کے برابر تو وہ اسے دیکھ لے گا''۔ (۷)

''اور جو کوئی بھی برائی کرے گا ایک ذرے کے برابر تو وہ اسے بھی دیکھ لے گا''۔ (۸)

امام ابن کثیرؒ نے لکھا کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ:

''برائی کی اہمیت کو کم مت سمجھو، وہ (ایک ایک کر کے) اکٹھی ہو جاتی ہیں، کسی شخص کو برباد کرنے کے لیے اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی شخص ایک یا دو لکڑے چھوٹی چھوٹی لکڑی کے ٹکڑوں کو اکٹھا کرے تو (چند ہی روز میں) اس کا (ایک چھوٹا سا) ڈھیر لگ جائے گا۔ اور اگر اس کو جلایا جائے تو وہ کسی چیز کو پکانے کے لیے مناسب آگ مہیا کرے گا''۔

سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۲۸۴) میں بھی جزا اور سزا کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اللہ ہی کا ہے، جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں (یعنی تمام تر حاکمیت ہر شے پر صرف اللہ ہی ہے) یا ان کے درمیان (یا اس کے علاوہ) اور چاہے تم بتا دو کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے، یا اسے چھپا لو۔ اللہ تم سے اس کا حساب ضرور لے گا (یعنی اچھائی یا برائی کا کیونکہ اللہ ظاہر اور خفیہ سے باخبر ہے) اور پھر وہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا (اس کے گناہوں کی)۔ اور اللہ تعالیٰ ہر کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے''۔

جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام پر بہت گراں گزری۔ اور وہ جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور بڑے تزک و احتشام کے ساتھ عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہمیں تو کہا گیا تھا کہ ہم سے وہ کام کرنے کو کہا جائے گا جس کی ہم میں طاقت ہوگی۔ لیکن ہم اپنے قلوب پر تو قابو نہیں پا سکتے''۔ اس پر جناب رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم لوگ دہرانا چاہتے ہو اس بات کو جو تم سے پہلے اہل کتاب کے دونوں گروہ کرتے تھے، اور انہوں نے کہا تھا کہ ''ہم نے سنا اور ماننے سے انکار کیا'' لیکن تمہیں تو یہ کہنا چاہیے کہ: ''ہم نے سنا اور مان لیا''۔ اور یہ کہنا چاہیے کہ: ''اور ہم آپ (اللہ) کی بخشش چاہتے ہیں، اے رب بیشک ہماری واپسی آپ ہی کے پاس ہوگی''۔

اس پر صحابہ کرام نے جناب رسول اللہ ﷺ کی بات تسلیم کرتے ہوئے آپؐ کے بتائے ہوئے الفاظ دہرانا شروع کر دیے۔ تو ان کے اس عمل کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس سے اگلی

آیت (۲۸۵) نازل فرمائی۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"(اللہ کا) رسول ایمان لایا اس پر جو ان کے رب نے ان پر اُتارا اور (اسی طرح سے) دیگر ایمان والے بھی (ایمان لائے)۔ ہر کوئی ایمان رکھتا ہے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ (اور وہ کہتے ہیں) ہم کوئی فرق نہیں رکھتے اللہ کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم سنتے ہیں اور ہم ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ (اور ہم چاہتے ہیں) آپ سے بخشش، اے ہمارے رب! اور آپ ہی کی طرف ہم سب نے واپس آنا ہے"۔

لہٰذا جب صحابہ کرام نے اللہ کے احکامات ماننے کا ارادہ کر لیا اور اس سے اپنی بخشش بھی طلب کی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس سے اگلی آیت (۲۸۶) نازل فرمائی۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اللہ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا یا اس پر بوجھ نہیں ڈالتا۔ وہ حاصل کرے گا انعام اس اچھائی کا جو اس نے کی ہوگی، اور سزا پائے گا اس خطا کی جو اس نے کی ہوگی۔ اے ہمارے رب! ہمیں اس بات پر سزا مت دیجیو اور اس کام پر جو ہم بھول گئے ہوں، یا کام کرنے میں ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ (ہماری بھول اور نادانی کی غلطیاں)۔ اے ہمارے رب! ہمارے اوپر بوجھ مت ڈالیے جو ہماری استطاعت سے زیادہ ہو۔ (اے اللہ) ہمیں معاف فرما، اور ہمیں بخشش عطا فرما۔ (اور) ہمارے اوپر رحم فرما (بیشک) آپ ہی ہمارے مولا ہیں (یعنی مالک اور مدد کرنے والے ہیں) اور ہمیں کامیابی عطا فرما کافروں کے مقابلے میں"۔

مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ماجہ میں منقول ہے جناب ابوہریرہؓ کی ایک روایت ہے کہ فرمایا جناب نبی کریم ﷺ نے کہ:

"اللہ نے میری امت کو معاف فرما دیا، جو کچھ ان کے قلوب میں ہے۔ (یعنی انہیں ان کی غلط سوچ اور خیالوں کی سزا نہ ملے گی) جب تک کہ وہ اپنی (غلط) سوچ اور خواہش کی تعمیل میں نہ لگ جائیں"۔

بخاری اور مسلم نے جناب ابوہریرہؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا (فرشتوں سے) کہ اگر میرے بندے کسی بُرائی کا ارادہ کریں تو اسے مت لکھنا، ان کے اعمال میں۔ اور اگر وہ اس بُرائی پر عمل کر لیں تو پھر اس برائی کو ایک ہی برائی لکھنا (لیکن اگر) وہ چاہیں کوئی نیک عمل کرنا اور اسے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکیں یا نہ کریں تو پھر اس کے لیے ایک اچھائی لکھ دینا۔ اور اگر وہ اس کام کو مکمل کر لیں تو پھر ان کے لیے دس (۱۰) اچھائیاں لکھ دینا"۔

سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ کتنا سخی اور مہربان ہے، اپنے بندوں پر۔

۸ (الف) روزِ قیامت کی رُوداد

سورۃ مریم (۱۹) کی آیات (۸۵ تا ۸۷)، (۹۳) (۹۵) اور (۹۲) میں روزِ قیامت کے مختلف حالات بیان کیے گئے ہیں۔

"اس روز ہم اکٹھا کریں گے متقی لوگوں کو اور وہ پیش کیے جائیں گے اپنے رحمٰن کے سامنے ایک وفد کی صورت میں (یہ ان کی قدر دانی اور عزت افزائی ہوگی)"۔ (۸۵)

"اور ہم ہانکیں گے مجرموں کو (اللہ اور رسول کے نافرمان) جہنم کی طرف، جبکہ وہ پیاس کی حالت میں ہوں گے"۔ (استغفر اللہ) (۸۶)

"(اس روز) کسی کو بھی اختیار نہ ہوگا سفارش کرنے کا، لیکن سوائے اس کو جسے اجازت ملے گی اس بات کی الرحمٰن کی طرف سے"۔ (۸۷)

"زمین اور آسمانوں میں کوئی بھی نہ ہوگا، بلکہ سب کے سب آئیں گے رحمٰن کے سامنے، اس کے بندے (غلام) بن کر"۔ (بے بسی اور بے کسی کی حالت میں)۔ (۹۳)

"اور ہر کوئی آئے گا اکیلا قیامت کے روز"۔ (یعنی ان کا کوئی حمایتی ساتھ نہ ہوگا)۔ (۹۵)

"بے شک، وہ جو ایمان لائے (اللہ اور اس کے رسول پر) اور نیک کام بھی کیے تو الرحمٰن ان سے محبت کرے گا"۔ (۹۶)

صحیح بخاری میں منقول ہے جناب ابوہریرہؓ سے کہ فرمایا جناب رسول اللہؐ نے کہ:

"اگر اللہ کسی شخص سے محبت کرتا ہے تو وہ جبرائیلؑ کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ، اللہ فلاں فلاں سے محبت کرتا ہے، اس لیے تم بھی اس سے محبت کرو، پس جنت کے تمام مکین اس سے محبت کریں گے۔ اور پھر اسے عطا ہوگی خوشی زمین کے لوگوں سے"۔

سورۃ الانفطار (۸۲) کی آیات (۱۳ تا ۱۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"بے شک نیکوکار اور پرہیزگار لوگ ہوں گے خوش (قیامت کے روز)"۔ (۱۳)

"اور بے شک بدکار لوگ ہوں گے بھڑکتی ہوئی آگ میں (قیامت کے روز)"۔ (۱۴)

(اس روز) اس میں وہ داخل ہوں گے اور چکھیں گے مزا بھڑکتی ہوئی آگ کا (قیامت کے روز)"۔ (۱۵)

"(اس روز) ان لوگوں میں سے کوئی بھی غیر حاضر نہیں رہے گا"۔ (۱۶)

مذکورہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو خوشخبری سنائی ہے جو اس کے تابعدار بندے ہیں اور اپنے آپ کو اس کی نافرمانی سے بچاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو "ابرار" کہا گیا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول کے بعد اپنے والدین کے بھی فرمانبردار ہوتے ہیں اور شفیق ہوتے ہیں اپنے گھر والوں کے ساتھ۔ جبکہ ان کے برعکس گناہ گار اور نافرمان ہوتے ہیں جنہیں جہنم کی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

سورۃ ہود (۱۱) کی آیت (۱۰۳) میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"بے شک اس میں سبق ہے ان کے لیے جو ڈرتے ہیں آخرت کے عذاب سے۔ وہ ایسا دن ہے جس میں انسان اکٹھے ہو جائیں گے۔ اور وہ دن ہے جب تمام کے تمام حاضر کر دیے جائیں گے"۔

اس آیت شریفہ کی یہ تشریح کی گئی ہے کہ روزِ محشر ایک بڑا دن ہوگا۔ جس دن فرشتے حاضر کیے جائیں گے، رسول اور پیغمبر اکٹھے کیے جائیں گے، اور تمام کی تمام مخلوق حاضر کر لی جائے گی۔ انسان، جنات، پرندے، جنگلی جانور اور گھریلو سواری کے جانور۔ اس کے بعد سب سے زیادہ اور اعلیٰ انصاف کرنے والا ان کے درمیان ہوگا اور وہ بڑھاوے گا ان کے

اچھے اعمال انعام کے طور پر۔ (ماخوذ تشریح امام ابن کثیرؒ)

سورۃ ہود ہی کی آیت (۱۰۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اس روز، جب وہ آئے گا (روزِ قیامت) کوئی شخص بھی بول نہ سکے گا (خوف کے مارے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت ہو۔ اور ان میں سے کچھ ایسے بدبخت ہوں گے کہ ان کی حالت قابلِ رحم ہوگی (عذاب کے خوف کی وجہ سے) اور کچھ لوگ رحمت پائیں گے (اللہ کی)"۔

پھر اگلی آیت (۱۰۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور وہ لوگ جو قابلِ رحم اور بدبخت ہوں گے، وہ مکین ہوں گے آگ کے، اور اس میں زَفِيرٌ اور شَهِيقٌ کا مزا چکھیں گے"۔

اس آیت کی تشریح میں جناب ابن عباسؓ نے فرمایا کہ:

اَلزَّفِيرُ۔ ایسی آواز ہوگی جو ان بدبختوں کے گلے سے نکلے گی (آگ کے شدید عذاب کی وجہ سے) جبکہ اَلشَّهِيقُ۔ ایسی آواز ہوگی جو ان کے سینوں سے نکلے گی (شدید تکلیف کی وجہ سے)۔ (استغفر اللہ) اللہ تعالیٰ جو رحیم و کریم ہے اس کی خدمت عالیشان میں التجا ہے کہ ہمیں ان شدائد اور مصائب سے بچائے رکھے۔ (آمین)

اسی سورۃ کی آیت (۱۰۸) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور وہ جن پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی، وہ اس کے فضل سے جنت مکین ہوں گے۔ اور رہیں گے اس میں ہمیشہ کے لیے، جب تک کہ آسمان و زمین باقی ہے۔ اس کے سوا جو تمہارا رب چاہے، یہ ایک تحفہ ہوگا نہ ختم ہونے والا"۔

اس آیتِ کریمہ میں الفاظ "اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ" کا مطلب بتایا گیا ہے کہ جنت کے معاملات خود بخود وارد نہیں ہو جائیں گے، بلکہ وہاں جو کچھ بھی ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشا سے ہوگا۔ اور ہمیشگی کا معاملہ بھی اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہوگا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے بندوں پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ راضی کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

الحسن بصریؒ نے فرمایا کہ یہ بات ان لوگوں کے حق میں کہی گئی ہے جو نافرمان ہوں گے توحید کے ماننے والوں میں سے اور جب وہ جہنم سے نکالے جائیں گے تو پھر ان کے لیے تجدید ہوگا نہ ختم ہونے والا۔

اسی بات کو سورۃ الانبیا (۲۱) کی آیت (۲۳) میں مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"اس (اللہ) سے سوال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کیا کرتا ہے، جبکہ ان (انسانوں) سے سوال ہوگا"۔ (کہ انہوں نے کیا کیا اور کیوں کیا، کیونکہ ان پر فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مکمل تابعداری کریں)۔

ایسا ہی مضمون سورۃ البینۃ (۹۸) کی آیات (۶ تا ۸) میں بھی وارد ہوا ہے کہ:

"بے شک وہ جنہوں نے کفر کیا اہل کتاب میں سے اور مشرکین میں سے، وہ ڈالے جائیں گے جہنم کی آگ میں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ ہیں بدترین مخلوق میں سے"۔ (۶)

"بے شک وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل بھی کیے وہ بہترین مخلوق ہیں"۔ (۷)

"ان کا انعام ہے ان کے رب کے پاس جنت، جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے اور اللہ تعالیٰ اُن سے خوش ہوں گے اور وہ اس سے۔ یہ اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرا"۔ (۸)

ان آیات شریفہ میں ایمان والوں اور غیر ایمان والوں کا انجام بتلایا گیا ہے۔ یعنی مختصراً اللہ تعالیٰ کے تابعدار بندے اس کی بہترین مخلوق ہیں، جبکہ نافرمان بدترین۔ اور اسی لحاظ سے ان کا انجام بھی اعلیٰ ترین اور بدترین ہوگا۔

جناب احمد بن حنبلؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسول کریم ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ:

"کیا میں تمہیں بہترین لوگوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟" انہوں نے کہا: ہاں! یا رسول اللہ ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ جو ہمیشہ اپنے گھوڑے کی لگام تھامے انتظار کر رہا ہو، جہاد

کی پکار کا"۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "اب مجھے بتانے دو، لوگوں میں سے سب سے اچھے کی، وہ! جو کوئی اپنی بھیڑ کے درمیان ہو اور اپنی صلوٰۃ نہ چھوڑتا ہو، اور نہ ہی زکوٰۃ دینا چھوڑتا ہو"۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا تمہیں نہ بتاؤں سب سے بُرے لوگوں کے بارے میں"۔ صحابہ کرام نے کہا: "ہاں" اے اللہ کے رسول ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ! جسے کہا جائے کچھ دینے کے لیے اللہ کے نام پر، اور وہ نہ دے"۔

سورۃ الاعراف (۷) کی آیات (۴۰) اور (۴۱) میں ان لوگوں کا بیان ہے جو متکبر اور جھٹلانے والے ہیں اللہ کی آیات کو، اور یہ کہ روزِ قیامت ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا۔ فرمایا:

"وہ جو جھٹلاتے ہیں ہماری آیات اور ان سے متکبرانہ برتاؤ کرتے ہیں، ان کے لیے آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، اور وہ جنت میں داخل نہ کیے جائیں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ گزر جائے"۔ (جو ناممکن ہے)۔ (۴۰)

"اور ان کے نیچے ہوگا "مِهَادٌ" (آگ کا بستر) جہنم کے اندر، اور اس کے اوپر ہوگی "غَوَاشٍ" (آگ کی چادر) جو انہیں ڈھانپ لے گی اور یہی ہے بدلہ ظالموں کے لیے ان کے اعمال کا، (یعنی اللہ اور رسول کی نافرمانی کا)"۔ (۴۱)

اسی سورۃ کی اگلی آیات (۴۲) اور (۴۳) ان لوگوں کے واسطے آئی ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانا۔ "لیکن وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال بھی کیے، ہم بوجھ نہیں ڈالتے کسی شخص پر اس کی استطاعت سے زیادہ۔ اور ایسے ہی لوگ ہیں جنت میں جانے والے، جو وہاں ہمیشہ رہیں گے"۔ (۷:۴۲)

"اور ہم نکال باہر کریں گے ان کے سینے میں سے ہر قسم کا بغض (الغل)۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ کہیں گے "اللہ ہی کے لیے ہیں تمام تعریفیں اور شکر، جس نے ہمیں ہدایت بخشی، جو ہمیں یہاں لائی، اور ہم ہدایت نہ پا سکتے تھے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتے، بے شک ہمارے رب کا رسول سچائی کے ساتھ آیا"۔ اور ان کے لیے پکارا جائے گا: یہ ہے جنت جو تم نے پائی ہے بمیراث میں اس کے عوض جو تم کیا کرتے تھے"۔ (۷:۴۳)

۸۔(ب) قیامت کے بارے میں شک

کچھ لوگوں نے قیامت کے برپا ہونے پر تعجب کا اظہار کیا اور آج بھی ایسے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں جو اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان جو مرنے کے بعد مٹی کا حصہ بن جاتا ہے، وہ پھر سے کیونکر زندہ ہو کر واپس اُسی ساخت حالت میں لوٹ آئے گا۔ اور پھر اُس سے اس کے اعمال کا حساب بھی لیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں سورۃ الحج (۲۲) کی آیت (۵تا۹) میں فرمایا:

"اے لوگو! اگر تم قیامت کے بارے میں کسی شک میں مبتلا ہو تو (جان لو کہ) بے شک ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے مٹی سے، پھر ایک نطفہ سے، پھر ایک خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کے ایک چھوٹے سے لوتھڑے سے، کچھ شکل دے دیا گیا اور کچھ شکل نہ دیا گیا۔ یہ (سب کچھ) ہم تم پر واضح کر رہے ہیں (تا کہ تم جان سکو) اور جسے ہم چاہتے ہیں کہ وہ رہے گا (ماں کے) رحم میں ایک مقررہ مدت کے لیے۔ پھر ہم تمہیں نکالتے ہیں باہر ایک بچے کی صورت میں۔ پھر (تمہاری پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی پوری طاقت کی عمر (جوانی) تک پہنچ جاؤ۔ اور (پھر) تم میں سے وہ ہے جو لایا جاتا ہے واپس قابل رحم حالت، بڑھاپے کی عمر میں۔ اس لیے وہ جانتا نہیں سب کچھ جاننے کے بعد بھی۔ اور تم دیکھتے ہو زمین جو بنجر ہو جانے کے بعد واپس سرسبز ہو جاتی ہے، جب ہم اس پر پانی بھیجتے ہیں اور پھر اس میں سے طرح طرح کے پیارے پیارے پھول پودے اُگتے ہیں"۔(۵)

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نہایت تفصیل کے ساتھ اپنے بندوں کو سمجھایا ہے کہ وہ تخلیق سے قبل کچھ نہ تھا۔ پھر اسے نہ ہونے سے ہونے میں لایا یعنی اسے پیدا کیا گیا اُس تخم میں سے جسے کھلی آنکھ سے دیکھا بھی نہ جا سکتا ہو۔ ایک ذرّے (Atom) کے برابر، جس کی باترتیب پرورش سے انسان وجود میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور پرورش کرنے کی قدرت سے اور پھر وہ ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہوتی ہے، اور پھر طاقتور جسم پاتا ہے اور کرتا ہے تڑاخ پٹاخ باتیں، غرور اور تکبر کے ساتھ، اور لوٹا جھٹکتا ہے، فساد پھیلاتا ہے اور خون بہاتا ہے۔ اور پھر اُن میں سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو غور

کرتے ہیں اپنی تخلیق پر اور پھر جان جاتے ہیں اپنے رب کی شان ربوبیت اور حاکمیت کو اور پھر گزارتے ہیں اپنی زندگی اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری کے ساتھ۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مثال دی ایسی زمین کی جہاں پر محض بارش سے ہی کاشتکاری ہوتی ہے۔ یعنی جب بارانی علاقوں میں بارشیں نہیں ہوتیں تو وہ خشک اور بنجر اور بے آباد ہو جاتی ہے۔ اور اس پر کوئی گمان ہی نہیں گزرتا کہ وہاں کبھی سبزہ بھی ہوا ہوگا۔ لیکن پھر اللہ تعالیٰ وہاں بارش برساتے ہیں اور یہی زمین طرح طرح کے پھول، پھل اور اناج اُگاتی ہے اور پھر سے بارش کے نہ ہونے پر یہ زمین دوبارہ بنجر ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ اُس وقت تک چلتا رہے گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ چاہیں گے۔

یہاں تک کہ ایک روز قیامت برپا ہوگی اور دنیا اور اس کی ہر شے فنا ہو جائے گی۔ اور زمین اپنے اندر دفن شدہ تمام انسانوں کو باہر پھینک دے گی اور وہ تمام کے تمام انسان دوبارہ زندہ ہو کر اپنے رب کی حضوری میں حاضر کر دیے جائیں گے۔ تو پھر انسان کو کیوں عقل نہیں آتی کہ ہم سب کا اور جو کچھ بھی موجودات میں ہے سب کا خالق اور مالک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی ہے۔ اور طاقت اور رائفل کا طبع کر جو چاہے کر گزرتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے بندوں کی تربیت ہر دور اور ہر علاقے میں فرمائی اپنے انبیاء کے ذریعے تا کہ وہ اپنے مالک کی منشا و مرضی کے مطابق زندگی گزاریں۔ لیکن بہت سے انسان خوابِ غفلت میں تھے اور ہیں۔ اور روزِ قیامت کے لیے تیاری نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکامات سے بالکل بے خبر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سورۃ الحج (۲۲) کی اگلی آیت (۶) میں فرمایا گیا ہے پچھلی آیت (۵) کے حوالے سے کہ وہ کس طرح سے کسی بھی شے کو نہ ہونے سے ہونے میں لاتا ہے۔ اب فرمایا کہ:

"یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے"۔

پھر فرمایا اگلی آیت (۷) میں کہ:

"اور یہ کہ قیامت قطعاً آنے والی ہے، جس میں کوئی شک اور شبہ نہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ

قبر والوں کو دوبارہ زندہ کرے گا''۔

فرمایا آیت (۸) میں:

''بعض لوگ اللہ کے بارے میں بغیر علم کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر روشن کتاب کے جھگڑتے ہیں''۔

مطلب یہ کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا علم حاصل کیے بغیر اس کی نفی کر دیتے ہیں۔ اور اپنی طرف سے احکامات کی نفی شروع کر دیتے ہیں، اور اپنی عقل سے ہی غلط اصول و احکامات وضع کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح سے بہت بڑے گناہ میں مبتلا ہونے کا جرم کرتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے وعید سنائی ہے اگلی آیت (۹) میں:

''اپنی گردن اکڑاتے ہوئے غرور کے ساتھ اور بہکاتے ہوئے اللہ کی راہ سے۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلت ہے اس دنیا میں اور قیامت کے روز بھی ان کو مزا چکھایا جائے گا، اللہ کی طرف سے بھڑکتی ہوئی آگ کا''۔

جہالت کی سب سے بڑی نشانی غرور ہے یعنی جہالت علم سے بے بہرہ کر کے غرور پیدا کرتی ہے اور انسان کو گمراہ کر کے ذلت کے گڑھے کی طرف دھکیلتی ہے۔ اس کی واضح مثال ابلیس کی ہے۔ جس نے اپنی جہالت کی وجہ سے اپنے آپ کو اعلیٰ اور آدم کو پست جانا اور اس بات پر غرور کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کا منکر ہو گیا، جس کے نتیجے میں ہمیشہ کے لیے دھتکارا گیا۔

سورۃ النباء (۷۸) کی آیت (۱ تا ۵) میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو روزِ قیامت میں شک کرتے تھے۔ یہاں قیامت کی خبر کے بارے میں لفظ ''النباء'' استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہے ''بڑی خبر'' یعنی کفارِ عرب اور دیگر انسانوں کے لیے یہ ایک بڑی خبر تھی اور آج بھی تمام انسانوں کے لیے بہت بڑی اور اہم خبر ہے۔ آج بھی اور زمانہ قبل میں بھی لوگ قیامت کے آنے اور دوبارہ زندہ ہو جانے کو حیرت کی نظر سے دیکھتے اور سنتے تھے۔

ان آیات میں فرمایا گیا ہے:

''وہ کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟''۔(۱)

''کسی بڑی خبر کے بارے میں؟''۔(۲)

''جس کے بارے میں وہ مانتے نہیں''۔(۳)

''نہیں! وہ جان جائیں گے''۔(۴)

''نہیں! پھر وہ جان جائیں گے''۔(۵)

کفارِ عرب روزِ قیامت کی بابت یقین نہیں رکھتے تھے۔ جب انہیں جناب رسول کریم کی جانب سے اس بارے میں پیغام ملا کہ قیامت آئے گی اور تمام مخلوق دوبارہ زندہ ہو کر مالک ارض و سماء کے حضور پیش کی جائے گی۔ اور پھر ان سے ان کے اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اور ان کے اچھے کاموں کا انعام اور برے کاموں کی سزا سنائی جائے گی۔

اہلِ عرب اس عقیدہ کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات کیا کرتے تھے، اور پھر عقیدۂ قیامت کے منکر ہو جاتے تھے۔ لہٰذا درج بالا آیات میں فرمایا گیا کہ یہ لوگ اس بڑی خبر کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور اس کے منکر ہوتے ہیں، وہ جلد ہی اس روز کو پا لیں گے۔

پھر اسی سورۃ النباء (۷۸) کی آیات (۳۹) اور (۴۰) میں منکرینِ قیامت کو تنبیہ کے طور پر بتلایا گیا ہے کہ:

''یہ دن حق ہے، اب جو چاہے اپنے رب کے پاس ٹھکانہ بنا لے''۔(۳۹)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنا فیصلہ تنبیہ کے طور پر سنا دیا ہے کہ قیامت کا آنا تو بہر حال حق ہے، اگر یہ منکرین نہیں مانتے تو نہ مانیں۔ جو شخص اس دن کی ذلت اور رسوائی سے بچنا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکامات پر عمل پیرا ہو جائے۔

اسی بات کو اگلی آیت (۴۰) میں واضح کر دیا گیا ہے۔ فرمایا:

''ہم نے تمہیں عنقریب آنے والے عذاب سے ڈرا دیا (اور چوکنا کر دیا) جس روز انسان اپنے ہاتھوں کی کمائی کو دیکھ لے گا (یعنی اپنے اچھے اور برے اعمال کو) اور پھر کافر کہے گا، اے کاش! (کہ) میں مٹی ہو جاتا''۔(۴۰)

لیکن اس دن کسی کو پچھتانا ان کے کسی کام نہ آئے گا اور پھر بد اعمال لوگ اپنے تکبر، جہالت اور برے اعمال کی سزا پائیں گے۔

اس بارے میں سورۃ الجاثیہ (۴۵) کی آیت (۳۱) اور (۳۲) میں فرمایا گیا ہے:

"لیکن جن لوگوں نے کفر کیا تو (ان سے کہا جائے گا) کیا میری آیات تمہارے سامنے پڑھ کر سنائی نہیں جاتی تھیں؟ لیکن تم تو مغرور تھے اور ایسے تھے جو مجرم ہوتے ہیں"۔ (۳۱)

"اور جب کبھی کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ یقیناً سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں، تو تم جواب دیتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے؟ بلکہ یہ ایک سن گزرت بات ہے اور ہم اس پر یقین نہیں رکھتے"۔ (۳۲)

۸۔(ج) قیامت کا وقت

قیامت کب وقوع پذیر ہوگی اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے سورۃ النازعات (۷۹) کی آیت (۴۲) تا (۴۴) میں بیان فرمایا گیا ہے کہ:

"وہ تم سے سوال کرتے ہیں، اس وقت کا جب وہ واقع ہوگی"۔ (۴۲)

"آپؐ کو اس بارے میں علم نہیں"۔ (۴۳)

"اس کا علم تو صرف تمہارے رب کو ہے"۔ (۴۴)

جب لوگوں نے آپؐ سے قیامت کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کب وقوع ہوگی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ وہ ان سے کہیں کہ نہ تو انہیں اس کا علم ہے اور نہ ہی اس وقت کے متعلق کوئی اور جانتا ہے۔ یہ تو صرف رب ذوالجلال والاکرام ہی کے علم میں ہے۔

ایک مرتبہ جبرائیلؑ جناب رسول کریمؐ کے پاس انسانی صورت میں وارد ہوئے۔ اور انہوں نے آپؐ سے سوالات کرتے ہوئے یہ بھی دریافت کیا کہ وہ روزِ قیامت کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ نہ تو وہ جانتے ہیں اور نہ ہی اسے سوال کرنے والا جانتا ہے۔

پھر اس کے بعد سورۃ النازعات (۷۹) کی آیت (۴۵) اور (۴۶) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو یاد دہانی کرائی کہ وہ تو صرف تنبیہ کرنے والے ہیں، ان لوگوں کو جو اس دن کا خوف رکھتے ہیں اور صرف وہی لوگ اس دن فائدہ اٹھائیں گے، کیونکہ وہی اس دن کے

عذاب سے بچنے کی تیاری میں لگے رہیں گے۔ جبکہ دوسرے لوگ جو مخالفت کرتے ہیں اس دن کی اور تنبیہ کرنے والے کی وہ سامنا کریں گے اُس روز ایک خوفناک عذاب کا۔

پھر اسی بات کو سورۃ القمر (۵۴) کی آیت (۴۶) تا (۴۸) میں فرمایا گیا کہ:

"لیکن انہیں (کافروں کو) سزا دینے کا مقررہ وقت تو روزِ قیامت ہی ہے اور وہ دن بہت سخت اور رُسوا کرنے والا ہوگا"۔ (۴۶)

"بے شک مجرمین بہت بڑی غلطی اور گمراہی پر ہیں"۔ (۴۷)

"اُس روز ان کو منہ کے بَل گھسیٹ کر جہنم میں ڈالا جائے گا (اور پھر ان سے کہا جائے گا) اب چکھو آگ کا مزا"۔ (۴۸)

اس لیے ہمیں قیامت کے وقت کے بارے میں چنداں جاننے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم کسی وقت بھی موت سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ بس ہمارے لیئے وہی قیامت کی شروعات ہیں، کیونکہ اعمال کا وقت موت کے بعد ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد سزا یا جزا ہی پائی جاتی رہتی ہے۔ پس! ہمیں صرف اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ ایک روز اچانک قیامت برپا ہوگی اور پھر حشر کا میلہ سجے گا۔ جہاں آدمؑ اپنی تمام اولاد کے ساتھ اپنے اللہ رب العزت ذوالجلال والاکرام کی حضوری میں صف بستہ، پریشان حال، بے بس اور بے کس حال میں اپنے انجام کے منتظر ہوں گے۔ جس نے بھی اس روز کے لیے اپنی مکمل تیاری کی ہوگی یعنی اپنی زندگی اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کے مطابق گزاری ہوگی وہ اس دن اطمینان میں ہوں گے، لیکن بے عمل، بدعمل، جاہل اور مغرور بے ایمان شخص نہایت ذلت کے عالم میں اپنے انجام کے منتظر ہوں گے۔

لہٰذا ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ اس زندگی کے میلوں ٹھیلوں میں لطف اندوز ہونے کی بجائے اس بڑے دن کی تیاری میں محنت کرتے رہیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی کے طلبگار رہیں۔ بس اسی میں ہماری فلاح ہے۔

۸۔(د) کتاب اعمال اور روزِ قیامت

یہ بات تو عوام الناس کے علم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، جو اپنی باریاں بدل کر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک انسان کی اچھائی جبکہ دوسرا اس کی برائی کو قلمبند کرتا ہے۔ اس طرح سے ہر انسان کی زندگی کے اختتام پر یہ اعمال نامہ ایک کتابی صورت اختیار کر لیتا ہے، جو روزِ قیامت ہر انسان کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت (۱۳) میں بیان فرمایا ہے:

"ہم نے لٹکا دی ہر انسان کے اعمال کی کتاب، اس کی گردن کے ساتھ۔ اور روزِ قیامت ہم اس کے سامنے اس کا اعمال نامہ نکالیں گے، جسے وہ اپنے اوپر کھلا ہوا پائے گا"۔

یہ بات آج سے پچاس برس پہلے تک تو نہایت عجیب لگتی تھی، لیکن آج اکیسویں صدی کے اوائل میں یہ بات سمجھا چنداں مشکل نہیں لگتی۔ کیونکہ بجلی کی رفتار سے حساب کتاب کرنے والی مشین (Computer) نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ناخن کے برابر ایک چپ (Chip) پر اتنی معلومات فراہم کی جاتی ہیں کہ اگر ان باتوں کو قلمبند کیا جائے تو کتابوں کی کئی الماریاں بھر جائیں۔ کوئی عجب نہیں کہ ہمارے ذہن کے کسی حصے میں اس قسم کے دو چپ (Chip) لگے ہوئے ہوں جن پر علیحدہ علیحدہ ہماری اچھائی اور برائی کی فلم بنتی جا رہی ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت کے روز تمہارے ہاتھ پاؤں اور زبان وغیرہ تمہارے اعمال کی گواہی دیں گے۔ لہٰذا یہ حقیقت سامنے آ گئی ہے کہ ہمارے یہ اعضا اس روز ہر لمحے کی اور ہر بات کی گواہی کے لیے کافی ہوں گی۔

پھر اگلی آیت (۱۴) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"پڑھو اپنی کتاب تم بذاتِ خود۔ آج تو تم خود ہی اپنا حساب رکھ لو گے"۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ کتاب اچھے اور برے دونوں قسم کے اعمال ظاہر کرے گی، اور انسان کے لیے اپنی صفائی پیش کرنے کا کوئی جواز باقی نہ رہے گا۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اس موضوع کے شروع میں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے

اعمال لکھنے کے لیے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، تو اس بارے میں قرآن الحکیم کی آیات درج کی جا رہی ہیں۔

سورۃ قٓ (۵۰) آیت (۱۷) اور (۱۸) میں بیان ہے کہ:

"(یاد رکھو) دو وصول کرنے والے (فرشتے) لکھتے ہیں (ہر انسان کے لیے) ان میں سے ایک بیٹھا ہے دائیں اور دوسرا بائیں طرف"۔ (۱۷)

"ایک لفظ بھی جو ان کے منہ سے نکلتا ہے اس کے لیے ایک نگہبان تیار رہتا ہے، (لکھنے کے لیے)"۔ (۱۸)

اسی بات کو ایک اور طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ الانفطار (۸۲) کی آیات (۱۰) تا (۱۲) میں:

"یقیناً تم پر نگہبان مقرر ہیں"۔ (۱۰)

"جو عزت والے ہیں اور مقرر ہیں لکھنے کے واسطے"۔ (۱۱)

"جو کچھ تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں"۔ (۱۲)

صحیح بخاری میں منقول ہے اس بارے میں کہ فرمایا جناب ابوہریرہؓ کہ جناب رسول کریمؐ نے فرمایا کہ:

"فرشتے حاضر ہوتے ہیں تمہارے اوپر باری باری، رات کو اور دن کو۔ اور وہ تمام اکٹھے ہوتے ہیں فجر اور عصر کے وقت۔ اور پھر وہ جو رہے ہوں گے تمہارے ساتھ رات بھر، اللہ کے پاس حاضر ہوتے ہیں، جو اُن سے پوچھتا ہے (حالانکہ وہ خود ان سے بہتر جانتا ہے) کہ: 'تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟' وہ جواب دیتے ہیں کہ: 'ہم نے انہیں چھوڑا جبکہ وہ نماز کی حالت میں تھے اور ہم ان کے پاس آئے تھے، جبکہ وہ نماز میں مصروف تھے'"۔

عالیجناب رسول کریمؐ نے اس بارے میں مزید فرمایا:

"اگر تم میں سے کوئی آمین کہتا ہے (اپنی نمازوں کے دوران سورۃ فاتحہ کے اختتام پر) تو اس وقت فرشتے بھی یہی کہہ رہے ہوتے ہیں آسمانوں پر۔ اور جب یہ دونوں آوازیں

(آمین کہنے کی) مل جائیں تو بندے کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں''۔ (بخاری)

درج بالا سورۃ الانفطار کی آیت (۱۱) کے بارے میں فرمایا ابن عباسؓ نے کہ، نا لیجناب رسول کریمؐ نے فرمایا کہ:

''اللہ تعالیٰ نے حکم دیا (ان فرشتوں کو جو تمہارے اوپر مقرر کیے گئے ہیں) کہ اچھے اور برے (دونوں) اعمال لکھے جائیں۔ اور پھر انہیں لکھنے کا اصول بھی بتا دیا کہ: اگر کوئی شخص ارادہ کرے کوئی اچھا کام کرنے کا اور اسے پورا بھی کرے تو پھر اللہ لکھے گا اس کے حساب میں (اجر) دس سے سات صد گنا تک یا اس سے بھی زائد۔ اور اگر کوئی ارادہ کرے اچھے کام کا اور اسے پورا نہ کر پائے تو اللہ تعالیٰ لکھے گا اس کے حساب میں ایک پورا اچھا کام۔ اور اگر کوئی ارادہ کرے کسی برے کام کا اور اسے کر نہ پائے تو اللہ تعالیٰ لکھے گا اس کے حساب میں ایک اچھا کام (کیونکہ برائی کا ترک کرنا بھی اچھا کام ہے)۔ اور اگر کوئی ارادہ کرے کسی برے کام کا اور اسے کر لے تو، اللہ تعالیٰ لکھے گا اس کے حساب میں ایک برائی''۔

یہ سخاوت اور فضل اللہ تعالیٰ کا اس وجہ سے ہے کہ وہ اولادِ آدم سے بے انتہا محبت فرماتا ہے، اور چاہتا ہے کہ اسے جہنم کے عذاب سے بچالیا جائے۔

سورۃ الانعام (۶) کی آیت (۱۶۰) میں بھی یہی مضمون آیا ہے فرمایا گیا ہے کہ:

''جو کوئی بھی لاتا ہے کوئی اچھا کام تو وہ پائے گا دس گنا، اپنے حساب میں۔ اور جو کوئی لائے گا برا کام تو پھر اسی کا ذمہ دار ہوگا اور ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

۸۔ (ھ) روزِ قیامت اپنا اپنا بوجھ اٹھانا ہوگا

سورۃ نجم (۵۳) کی آیت (۳۸) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''کوئی گناہ گار شخص کسی دوسرے کا گناہ اپنے ذمہ نہیں لے گا''۔

پھر اگلی آیت (۳۹) میں فرمایا گیا:

''ہر انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے کوشش کی ہوگی''۔

یعنی جو کوئی جتنی اچھائی کرے گا اس کا ویسے ہی اجر پائے گا۔ جبکہ اپنی برائی کی سزا بھی خود ہی پائے گا۔

ایسا ہی مضمون سورۃ فاطر (۳۵) کی آیت (۱۸) میں بھی آیا ہے۔

''اور اگر کوئی بوجھ اٹھانے والا (گناہ گار) کسی دوسرے کو پکارے گا مدد کے لیے تو وہ اس کے بوجھ میں سے کچھ بھی نہ اٹھا سکے گا، چاہے وہ اس کا قریبی رشتے دار ہی کیوں نہ ہو گا''۔

صحیح مسلم میں جناب ابوہریرہؓ سے ایک روایت منقول ہے کہ فرمایا جناب رسول اللہؐ نے کہ: ''جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو اس کا اعمال نامہ بند کر دیا جاتا ہے، سوائے تین وجوہ کے: (i) ایک تو یہ کہ اس کی نیک اولاد اس کے لیے مغفرت کی دعا کرے۔ (ii) دوسرا وہ شخص اپنی زندگی میں کوئی ایسا صدقہ یعنی نیک عمل کر گیا ہو جس کا فائدہ لوگوں کو اس کے مرنے کے بعد بھی مل رہا ہو۔ اور (iii) تیسرا یہ کہ وہ اپنا کوئی علم چھوڑ گیا ہو جو لوگوں کے لیے فائدہ مند ہو''۔

روزِ قیامت مدد کے سلسلے میں سورۃ الشوریٰ (۴۲) کی آیت (۴۶) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اور (اس روز) ان کا کوئی اولیاء نہ ہوگا (جن سے وہ اللہ کے سوا دنیا میں مدد چاہا کرتے تھے) کہ ان کی کوئی مدد کرے، سوائے اللہ کے۔ اور وہ جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے (ان کے اعمال کی وجہ سے) پھر ان کے لیے (بچنے کے لیے) کوئی راستہ نہیں''۔

سورۃ النجم (۵۳) کی آیات (۴۰) اور (۴۱) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اور (اس روز) اس کے اعمال دیکھے جائیں گے''۔

''اور پھر اسے (اس کے اعمال کا) پورا پورا بدلہ ملے گا''۔

یعنی روزِ حساب ہر شخص کے اعمال اس کے سامنے رکھ دیے جائیں گے اور وہ اپنے اعمال کا پورا پورا اجر وصول کریں گے، اور اس روز کسی نفس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہوگی۔ اس کی اچھائی کا بہترین اجر جبکہ ہر برائی کا بدلہ۔ اس لیے ہر شخص کو اپنے اعمال کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے، تاکہ روزِ قیامت اسے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ اس ضمن میں سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۱۰۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اور کہو (اے محمدؐ)! عمل کرو (یعنی اچھے عمل) کیونکہ اللہ تمہارے اعمال ملاحظہ فرمائے گا (اور ایسا ہی ہوگا) رسول اور مومنوں کے ساتھ بھی اور تم واپس لائے جاؤ گے، اس کے

پاس جو ہر شے کا جاننے والا ہے، خواہ خفیہ ہو یا ظاہر۔ پھر وہ تمہیں آگاہ کرے گا کہ تم کیا کیا کرتے تھے''۔

پھر سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۱۱۹) میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو نصیحت فرمائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھیں اور ہمیشہ حق کا ساتھ دیں۔ فرمایا کہ:

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ان لوگوں کا ساتھ دو جو سچے ہیں''۔

ایمان والوں کے لیے ضروری ہے کہ اپنے اعمال کی بنیاد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی تابعداری اور فرمانبرداری کے اصول پر رکھتے ہوئے کریں۔ ایمان والوں کے لیے صرف سچ اور حق کا جاننا ہی ضروری نہیں بلکہ اس پر عمل ضروری ہے، جو روزِ قیامت پرکھے جائیں گے۔

بخاری میں عالی جناب رسول کریمؐ کا ایک قول منقول ہے جو روایت کیا ہے جناب عبداللہ نے (یہاں یہ واضح نہیں کہ وہ عبداللہ بن عباسؓ تھے یا عبداللہ بن عمرؓ) بہرحال حدیثِ مبارکہ کے مندرجات درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

''سچائی لے کر جاتی ہے، البِرّ کی طرف اور البِرّ (اچھائی) لے کر جاتی ہے جنت کی طرف۔ جب کوئی شخص سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ سچا انسان بن جاتا ہے۔ (جبکہ) جھوٹ لے کر جاتا ہے 'الفُجُور'' کی طرف اور الفُجُور (گناہ اور مکاری) لے کر جاتا ہے جہنم کی آگ کی طرف۔ جب کوئی شخص جھوٹ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ لکھا جاتا ہے جھوٹا اللہ کے سامنے''۔

۸۔ (و) قیامت پر ایمان نہ لانے والوں کی دنیا میں سزا

فرمایا گیا ہے سورۃ الاسراء (۱۷) کی آیت (۴۵) میں کہ:

''اور جب تم (اے محمدؐ) قرآن سناتے ہو تو (اس دوران) ہم ایک نظر نہ آنے والا پردہ ڈال دیتے ہیں تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان، جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے''۔

اس آیت کریمہ کے بارے میں امام قرطبی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

''روایت کیا ہے سعید بن جبیر نے کہ جب سورۃ تبت یدا (۱۱۱) نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی جناب رسالت مآبؐ کو تلاش کرتی ہوئی آئی۔ اس وقت جناب ابوبکرؓ آپؐ کے پہلو

میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جناب ابوبکرؓ نے عالیجناب رسول کریمؐ سے کہا کہ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں سے ہٹ جائیں، کیونکہ وہ ہماری طرف ہی آ رہی ہے۔ اور کہیں وہ آپؐ کو نقصان نہ پہنچا دے''۔ اس پر جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ''میرے اور اس کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جائے گا''۔ پس اس نے آپؐ کو نہ دیکھا اور جناب ابوبکرؓ سے کہنے لگی کہ 'تمہارا ساتھی میرے خلاف کچھ اشعار کہہ رہا ہے'۔ اس پر جناب ابوبکرؓ نے کہا: 'اللہ کی قسم! وہ شاعری نہیں کرتا'۔ وہ کہنے لگی: 'کیا تمہیں یقین ہے؟' اور پھر وہاں سے چلی گئی۔ پھر جناب ابوبکر صدیقؓ نے کہا: 'اے اللہ کے رسول! اس نے آپ کو نہیں دیکھا۔ اس پر جناب نبی کریمؐ نے فرمایا: 'ایک فرشتے نے پردہ کر رکھا تھا میرے اور اس کے درمیان'۔

پس یہ دنیا ہی میں نافرمان اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کی سزا ہے کہ وہ حق بات سن ہی نہیں سکتے، اور اگر سنتے بھی ہیں تو سمجھ نہیں سکتے۔ ان بدبختوں کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور وہ مانند گونگے، بہرے اور اندھے لوگوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ (۲) کی آیت (۱۷) اور (۱۸) میں فرمایا ہے کہ:

''ان کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے آگ جلائی اور پھر جب آگ کی روشنی اس کے اطراف پھیل گئی تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی واپس لے لی، اور انہیں اندھیرے میں چھوڑ دیا۔ پس وہ دیکھ نہیں سکتے''۔

''وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں، پس وہ واپس نہیں آ سکتے (صحیح راستے پر)''۔

ان آیات کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر کفر کا اتنا زیادہ غلبہ ہو جاتا ہے کہ وہ دنیا کے لہو و لعب میں اتنے زیادہ گم ہو جاتے ہیں کہ انہیں ایمان کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اور جب وہ ایمان اور آخرت کے بارے میں کچھ سنتے ہیں تو وہ ایسے ہو جاتے ہیں کہ گویا انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اس واسطے ان کے اس جاہلانہ اور متکبرانہ رویے کے سبب اللہ تعالیٰ ان کے قلوب کو ایمان کی روشنی کے لیے بند کر دیتے ہیں''۔

اس مضمون کو سورۃ الحج (۲۲) کی آیت (۴۶) میں سمجھایا گیا ہے کہ:

"بے شک! یہ آنکھیں نہیں جو اندھی ہو جاتی ہیں، بلکہ یہ ان کے دل ہوتے ہیں ان کے سینوں میں جو اندھے ہو جاتے ہیں"۔

یہ بات ان لوگوں کے واسطے کہی گئی ہے جنہوں نے انبیاء کو جھٹلایا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی بستیوں کو برباد کر دیا، کیونکہ وہ نافرمان تھے اللہ اور اس کے انبیاء کے۔ ایسے لوگ جہالت اور بے وقوفی کے اس درجے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں پر چرنے والے جانور ہوتے ہیں جیسے بھیڑ، بکری وغیرہ۔

یہی مضمون سورۃ الاسراء (۱۷) کی آیت (۴۶) میں بھی آیا ہے فرمایا گیا کہ:

"اور ہم نے ڈال دیے پردے ان کے دلوں پر، پس وہ سمجھ نہیں سکتے (جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے) قرآن میں سے اور ان کے کان بہرے ہیں اور جب تم (اے محمدؐ) اپنے رب کا ذکر کرتے ہو اور توحید کے متعلق بیان کرتے ہو قرآن میں سے تو وہ اپنا رخ پھیر لیتے ہیں ناپسندیدگی کی وجہ سے"۔

پس ایسے لوگوں کو دنیا میں ہی سزا مل جاتی ہے، جو علم آ جانے کے باوجود بھی روزِ قیامت پر ایمان نہیں لاتے۔ ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور وہ مانند گونگوں اور بہروں کے ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو دنیا میں ہی سزا ملنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ روزِ قیامت میں سزا سے بری ہو جائیں گے بلکہ وہاں انہیں شدید عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے شدید تنبیہ کی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی دعوت قبول کر لیں اور ان پر ایمان لے آئیں۔ اس کی ایک مثال سورہ ابراہیم (۱۴) کی آیت (۷) سے دی جاتی ہے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے:

"اور (یاد رکھو) جب تمہارے رب نے فرمایا، اگر تم میرا شکر ادا کرو گے (ایمان لا کر) تو میں تمہیں زیادہ دوں گا (اپنی رحمتوں میں سے) لیکن اگر تم میرے ناشکرے رہو گے (ایمان نہ لا کر) تو بے شک، میری سزا بہت شدید ہے"۔

ایمان نہ لانے کے علاوہ وہ لوگ جو ایمان تو لاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے انعامات کو سمجھتے نہیں اور ناشکری کے مرتکب ہوتے ہیں وہ بھی اس آیت کے شمار میں آتے ہیں۔ اس

لیے انسان کو ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، راحت میں بھی اور مصیبت میں بھی۔ کیونکہ مصیبت یا تو ان کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے یا ان کی آزمائش، لہٰذا ہر حالت مصیبت میں شکر واجب بنتا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔

اس لیے اس بات کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ قیامت کے روز پر ایمان نہ لانا (یاد رہے کہ قیامت کے دن کی تیاری نہ کرنا بھی ایمان نہ لانے کے مترادف ہے) انسان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں رسوائی کا سبب بنتا ہے۔ اس بات کی ہزاروں مثالیں ہمارے سامنے ہیں، تاریخ بھی بھری پڑی ہے ایسے لوگوں کے ساتھ جنہیں دنیا میں ذلت اور رسوائی ملنے کے ساتھ دردناک موت بھی ملی اور قیامت کا عذاب ابھی باقی ہے۔

۹۔ تقدیر پر ایمان

لفظ تقدیر جسے عرف عام میں قسمت کہتے ہیں، اس کے لیے قرآن الحکیم میں دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ (۱) اَلْقَضَاء (۲) اَلْقَدَر۔ یہ دونوں الفاظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں، لیکن قرآن میں زیادہ تر لفظ القدر ہی استعمال کیا گیا ہے۔ لغت میں اَلْقَضَاء کا مطلب لکھا ہے "فرمان' اندازہ یا فیصلہ کرنا، وغیرہ۔ جبکہ القدر کا مطلب لکھا ہے انجام اور "اللہ کا حکم صادر فرمانا"۔

اس کے برعکس علماء ان الفاظ کا مطلب اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

اَلْقَضَاء کا مطلب: کسی کام کا مکمل کیا جانا اس کی بہترین حالت میں، اور اَلْقَدَر کا مطلب بتاتے ہیں کسی کام کے مکمل ہونے تک کے عمل کا اندازہ لگانا۔ انہی الفاظ کا مزید وضاحت کے ساتھ مطلب یہ بتایا جاتا ہے کہ:

اَلْقَضَاء: یہ ایک حتمی نظریہ ہے کہ ہر شے یا کام جو اس کائنات میں ظہور پذیر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکم سے ہوتا ہے۔ جبکہ اَلْقَدَر (i) اس بات پر ایمان لانا کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کو جانتا ہے اس کی مکمل تفصیل کے ساتھ۔ یعنی اس کے وجود میں نہ ہونے سے وجود میں آنے تک اور پھر اس کے ہونے سے نہ ہونے تک۔ یعنی اللہ تعالیٰ دنیا اور آسمانوں کی ہر شے کو اس طرح سے جانتا ہے کہ اس کے ہونے اور نہ ہونے تک کی کوئی بات اس کے علم سے باہر نہیں۔

(ii) اس بات پر ایمان لانا کہ اللہ نے ہر شے کی تقدیر لکھ دی تھی لوح محفوظ پر زمین اور آسمانوں کی پیدائش سے بھی قبل۔

(iii) اس بات پر ایمان لانا کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہی ہوتا ہے اور اس نے جو تقدیر لکھ دی ہے، وہ نہایت کامل ہے۔ یعنی زندگی، موت اور زندگی بعد از موت تک کا

ہر لمحہ لکھا ہوا ہے۔ اور یہ سب کا سب علم الغیب ہے جسے سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرا کوئی نہیں جانتا۔

(iv) اس بات پر ایمان لانا کہ ہر چیز جو ظہور میں آئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کی ہے۔ اور وہ ہی ہر شے کا خالق ہے، اور ان کی صفات اور اعمال کا بھی خالق ہے۔ جیسا کہ فرمایا سورۃ الانعام (۶) کی آیت (۱۰۲) میں کہ:

"وہ اللہ ہے تمہارا رب۔ اس کے سوا کسی اور کا حق نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے (وہ) ہر شے کا خالق ہے۔ پس صرف اُسی کی عبادت کرو اور وہی وکیل ہے ہر شے کا (یعنی ان کے کام کی تکمیل کرنے والا اور ان کا نگہبان)"۔

گویا القدر کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھ دینا انسان کی تکمیل کے عمل کو، ان کی ابتدا سے آخر تک کے لیے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے ان کے ساتھ ان کی زندگی میں، وہی ان کی تقدیر ہے اور اس امر کا صرف اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے۔

لہٰذا انسان کی زندگی میں جو حادثات، مشکلات اور آسانیاں آئیں گی وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوں گی۔ دوسرے الفاظ میں وہ انسان کی تقدیر کے مطابق ہوں گے۔ یعنی جن باتوں کو یا چیزوں کو یا مقصد کو وہ پانا چاہے گا یا وہ کسی خاص مشن یا محبت کو پانے کی لگن میں لگ جائے گا، اس کے لیے قطعاً ضروری نہیں ہوگا کہ وہ اپنے مقصود کو پانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اس کے سارے مقصود مل جائیں یا کچھ ملیں اور کچھ نہ ملیں یا کچھ بھی نہ ملے، اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق۔ کچھ ایسی چیزیں اسے مل سکتی ہیں جسے وہ نہ چاہتا ہوگا لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ لوگ اپنا مقصد اور خواہش پا لیں۔

لیکن ایک بات ہر انسان کو ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس کی چاہت اس کے لیے یا اس کی چاہت کے لیے فائدہ مند ہوگی کہ نہیں۔ اس کے لیے کسی مقصد کو حاصل کرنے یا نہ کرنے میں جو مصلحت پنہاں ہوتی ہے، اس سے یہ بے خبر ہوتا ہے اور بے نیاز بھی۔ لیکن اس کی خبر صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہوتی ہے اور وہی اس کی تقدیر ہوتی ہے۔

لہٰذا عقل و دانش کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کو جو کچھ بھی اچھائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے وہ اُسی پر صبر اور شکر کے ساتھ قناعت کرے۔ بلکہ انسان کو اپنا مقصود اور چاہت ان اصولوں کے مطابق رکھنی چاہیے کہ اسے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی نہ کرنی پڑے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے اچھائی اور برائی کے راستے واضح کر دیے ہیں۔ اور اپنی پسند اور ناپسند بھی اپنے بندوں کو بتا دی ہے اور ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ بندے کی اچھائیاں اسے اپنے رب کے قریب لاتی ہیں، جبکہ اس کی برائیاں اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہیں اور اس بات کو انسان کے اختیار میں دے دیا گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اچھائی یا برائی کو اختیار کرے۔ اس سلسلے میں سورۃ التکویر (۸۱) کی آیت (۲۸ اور ۲۹) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

"تم میں سے جو کوئی بھی چاہے اختیار کرنا سیدھا راستہ"۔

"اور تم چاہ نہیں سکتے، جب تک کہ اللہ نہ چاہے، جو رب ہے تمام جہانوں کا"۔

اس آیت شریفہ سے کوئی یہ مطلب اخذ نہ کر لے کہ اچھا یا برا راستہ تو اللہ ہی دکھاتا ہے، تو پھر گناہ یا نیکی کا تصور کیسا؟۔ دراصل مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اُس وقت سیدھا راستہ دکھاتا ہے جب وہ بندہ تقویٰ اختیار کرتا ہے اور اُسے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کی ناراضی کا خوف ہوتا ہے، اور وہ یہ چاہتا ہے ایسے کام کرنا جس سے اس کا رب اس سے راضی ہو جائے۔ یعنی یہ بات اس کے دل میں اللہ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے جب وہ اس کے ناراض ہونے سے خوف کھاتا ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ (۲) کی آیت (۲) میں فرمایا ہے کہ:

"یہ کتاب (قرآن) تو ہدایت ہے (صرف) ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں (یعنی اپنے رب سے ڈر کر اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتے)"۔

دوسری بات جو نہایت اہم ہے اور جس کا جاننا بہت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مصیبتوں، تکلیفوں، شدائد، رنج والم سے اس لیے گزارتا ہے کہ اس کی آزمائش کرے۔ تاکہ یہ پتا چل جائے کہ کیا وہ انسان اس قدر شدائد میں رہ کر بھی اس کا شکر ادا کرتا ہے یا نہیں، اور

اس کی بندگی میں بھی ہمہ تن مصروف رہتا ہے کہ نہیں؟

اس کی بہت سی مثالیں ہمیں قرآن الحکیم میں بتائی گئی ہیں اور تاریخ میں بھی رقم ہیں۔ مثلاً اسماعیلؑ کی والدہ حاجرہؓ جب صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگا رہی ہوتی ہیں، کسی پرندے کو دیکھنے کے لیے تاکہ ان کے ذریعہ سے کہیں پانی یا آبادی کے آثار ان پر ظاہر ہو جائیں تو اس وقت وہ شدید ترین مشکل اور پریشانی اور خوف کے عالم میں ہوتی ہیں، لیکن پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ نہیں کرتیں اور اس کی حمد و ثناء میں مصروف رہتی ہیں۔ اس وجہ کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا اور ان کی اس سنت کو اولادِ آدم کے لیے رہتی دنیا تک کے لیے قائم کر دیا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کسی بھی انسان کو اس کی وسعت سے زیادہ مشقت میں نہیں ڈالتا۔ اور اتنی ہی تکلیفوں میں ڈالتا ہے جتنی کہ اس کی استطاعت ہو۔ اس لیے فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ (۲) کی آیت (۲۸۶) میں کہ:

"اللہ تعالیٰ تکلیف نہیں دیتا کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ۔ اور انسان کو اتنا ہی انعام ملتا ہے جتنی کہ اس نے محنت کی ہوتی ہے اور جتنی وہ برائی کرتا ہے اتنی ہی وہ سزا کا حق دار ہو جاتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو زمین پر بھیجا ہی اس لیے تھا کہ وہ اُسے اور اس کی اولاد کو آزمائش میں ڈالے، اور پھر ان میں سے منتخب کرے، ایسے لوگوں کو جنہوں نے اپنی وفاداری کا ثبوت دے دیا ہو، اللہ تعالیٰ کے حضور۔ اور پھر ان کو بھیج دیا جائے اس جگہ جہاں سے کہ نکالا گیا تھا ان کے والدین کو۔ اس لیے کہ وہ جگہ ممنوع ہے رہنے کے لیے نافرمانوں کے لیے۔

سورۃ التکویر (۸۱) کی آیت (۲۹) کے بارے میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے اکثر لوگوں کے دلوں میں کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ "اور تم چاہ نہیں سکتے جب تک کہ اللہ نہ چاہے جو رب ہے تمام جہانوں کا"۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے تو پھر برے کام بھی تو اللہ کے حکم سے ہی ہوتے ہوں گے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس کی سزا کیوں کر ملے گی؟ اس خیال یا سوال نے مسلمانوں میں ایک فرقے کو جنم دیا ہے جو جبریہ کہلاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

انسان تو مجبورِ محض ہے، اسے اپنے افعال پر کوئی اختیار نہیں بلکہ وہ تو وہی کام کرتا ہے جو اس کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔

اس خیال یا سوال کے بارے میں علمائے حق کہتے ہیں کہ دراصل یہ خیال ایک شیطانی وسوسہ ہے۔ حقیقت دراصل یہ ہے اور یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ ہر کام، اچھا یا بُرا وہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے سرزد ہوتا ہے۔ لیکن اس کام کے ہونے میں اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حمایت شامل نہیں ہوتی۔ ہر انسان اپنے لیے اچھا یا بُرا کام منتخب کرتا ہے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق۔ اور پھر جب وہ اپنی تمام تر خواہش کے ساتھ اس کام کے کرنے کو ٹھان لیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی پسند اور مرضی کے مطابق اس کام کے ہونے کا حکم صادر فرما دیتے ہیں۔ لیکن وہ شخص یعنی فاعل اپنے کام کا خود ذمہ دار ہوتا ہے، اس لیے اچھے کام کا اجر جبکہ بُرے کام کی سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔

۹۔ (الف) نظریہ جبریہ و قدریہ

جبریہ:

اس نظریہ کے مطابق اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، اس لیے کائنات میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ یہی حال اس کی مخلوق کی بابت بھی ہے۔ اس لیے اس نظریہ کے مطابق جب اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے تو پھر انسان مجبورِ محض ہو جاتا ہے اور جب وہ مجبورِ محض ہو گیا تو پھر اس کے لیے سزا اور جزا کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ بھلائی کی طرف آئے اور بُرائی سے دور رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انسان کو اختیار بھی دیا گیا ہے اور اسے اس بات پر قدرت بھی حاصل ہے کہ وہ اچھائی اور بُرائی میں سے جسے بھی چاہے اختیار کرے۔ لیکن کچھ افعال انسان کی زندگی میں ایسے ہیں جن پر اسے قطعی اختیار نہیں ہوتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی بھی شخص کس ماں اور کس باپ سے پیدا ہوگا۔ اور دنیا کے کس ملک اور کس جگہ پیدا ہوگا، اور کن حالات میں پیدا ہوگا۔ کسی غریب کے گھر یا کسی امیر کے گھر۔ اُسے زندگی گزارنے کے کون کون سے ذرائع میسر آئیں گے یا وہ کسمپرسی کی

حالت میں پرورش پائے گا۔

لیکن ایک بات تو طے شدہ ہے کہ وہ کسی بھی حال میں ہو، اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی اس کی رضا اور اس کے طے شدہ قوانین کے مطابق گزارے۔ اس بارے میں وہ خود مختار ہے۔ مثال کے طور پر وہ نہایت کسمپرسی کی حالت میں یا تو محنت مزدوری کر کے اپنے وسائل پورے کرے یا چوری چکاری کر کے۔ یہی اس کی آزمائش ہے اور اسی بات پر اس کی آخرت کا فیصلہ ہوگا۔

لہٰذا جن لوگوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان تو محض مجبور کی گئی مخلوق ہے وہ غلط ہیں۔ کیونکہ انسان کا دنیا میں آنا صرف اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ ملاحظہ فرمائیں کہ اس کا بندہ اس کی اطاعت کرتا ہے یا نہیں۔

قدریہ:

اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ اپنے افعال پر کلی طور پر قادر ہے۔ یعنی اسے یہ اختیار ہے کہ وہ اچھائی یا برائی اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اسے اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے لیے اچھے یا بُرے افعال منتخب کرے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اچھے اور بُرے کاموں کے متعلق کامل آگہی دے دی ہے۔ جیسا کہ سورۃ نمل (۲۷) کی آیت (۹۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں قرآن پڑھ کر سناؤں۔ تو پھر جو کوئی بھی آگاہی حاصل کرے تو وہ اپنے لیے ہی بھلائی حاصل کرے گا اور جو کوئی بھی اس سے بھٹک جائے تو اسے کہو کہ میں تو صرف تنبیہ کرنے والا خبردار ہوں"۔

لیکن ان دونوں کے درمیان ایک واضح فرق یہ ہے کہ انسان جبر اور قدر کے درمیان ہے۔ کسی نے جناب علیؑ سے پوچھا کہ انسان کتنا مجبور ہے اور کتنا با اختیار ہے اپنے افعال پر؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ اپنی ٹانگ اُٹھاؤ، اس نے ایسا کر لیا۔ تو اس کے بعد جناب علیؑ نے فرمایا کہ اب اپنی دوسری ٹانگ بھی اٹھالو۔ اس پر سائل نے جواب دیا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے۔ چنانچہ جناب علیؑ نے فرمایا کہ بس تم اتنے ہی با اختیار ہو، جتنا کہ اپنی ایک

ٹانگ اٹھانے میں تھے اور اس کے ساتھ اتنے ہی مجبور ہو جتنا کہ تم دوسری ٹانگ نہ اٹھا سکنے پر مجبور ہو۔

اہل سنت کا اس بارے میں عقیدہ ہے، جس کی عبداللہ بن عمرؓ نے بھی حمایت کی ہے کہ:

عقیدۂ قدر کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھی گئی قسمت یا تقدیر یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ کو مرتب فرمایا تو اس میں درج کیا جو کچھ کہ ہو چکا ہے، اور جو کچھ بھی ہونے والا ہے۔ لہٰذا جو کچھ بھی ہونا باقی تھا اور اس کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہی قدر یا تقدیر یا قسمت ہے۔ اس سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ انسان نے جو کرنا ہے وہ تو پہلے سے لکھا ہوا ہے، تو پھر وہ اپنے برے کاموں کا ذمہ دار کیوں کر ہوا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان ہر کام اپنی صوابدید پر کرتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل نہیں ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ یہ جانتا ہے کہ وہ انسان کیا کرنے والا ہے۔ چنانچہ وہی اس کی قدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ دوسری یہ بات بھی ہے کہ انسان کے افعال اللہ تعالیٰ کی مرضی سے نہیں ہوتے، مرضی تو انسان کی ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہر کام کے سرزد ہونے میں اللہ کا حکم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ہر کام کے ہونے سے پہلے ہی علم ہوتا ہے کہ کیا کیا کام کیسے کیسے ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے وقت اور جگہ محدود نہیں، وقت اور جگہ تو صرف انسان کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے زمانے کی بھی قید نہیں، یعنی اس کے لیے نہ ماضی ہے نہ حال اور نہ مستقبل۔ اس کی نگاہ ہر شے پر محیط ہے، یعنی وہ آنے والے کل کو بھی جانتا ہے۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ جیسے ایک شخص جب ایک فلم دیکھتا ہے تو پہلی مرتبہ وہ اس فلم کے انجام سے واقف نہیں ہوتا، لیکن جب وہ وہی فلم دوسری بار دیکھتا ہے تو اسے آنے والے ہر سین کے متعلق خبر ہوتی ہے اور وہ اسے جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ السمیع اور البصیر ہے، وہ تمام کے تمام ہونے کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور سنتا بھی ہے۔ یعنی اس کی ذات سے آنے والا کوئی بھی واقعہ مخفی نہیں۔ اور یہ بھی مخفی نہیں کہ فلاں انسان آئندہ کیا کرنے والا ہے۔ اسی ضمن میں سورۃ الحدید (۵۷) کی آیت (۲۲۔۲۳) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"کوئی مصیبت نہیں آسکتی زمین پر، اور نہ ہی کسی نفس پر، اس کے سوا، جو کچھ کہ لکھ دی

گئی ہے کتاب میں (لوح محفوظ میں، اور یہی تقدیر ہے) اس کے ہونے سے قبل۔ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کے لیے نہایت آسان ہے"۔ (۲۲)

جناب ابن عباسؓ نے اس آیت کی شرح بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"ایک مرتبہ وہ جناب رسول اللہؐ کے عقب میں بیٹھے تھے کہ آپؐ نے فرمایا: 'اے بچے! میں تمہیں سکھاؤں گا چند باتیں'۔

الف) "اپنے رب کے تابعدار اور فرمانبردار رہو، اسے ہمیشہ یاد کرتے رہو، اس کے احکامات پر عمل کرو۔ وہ تمہیں بچائے گا ہر برائی سے اور تمہاری مدد کرے گا، زندگی کے ہر معاملے میں"۔

ب) "اللہ کے تابعدار اور فرمانبردار رہو، تم پاؤ گے اُسے اپنے پاس۔ یعنی وہ تمہاری التجاؤں کو قبول فرمائے گا"۔

ج) "اگر تمہیں کسی چیز کی حاجت ہے تو اللہ سے کہو"۔

د) "اگر تمہیں کوئی مدد درکار ہے تو اللہ تعالیٰ سے طلب کرو"۔

ہ) "اور اس بات کو سمجھ لو کہ اگر تمام لوگ اکٹھے ہو کر تمہیں کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں، تو وہ تمہیں فائدہ نہ پہنچا سکیں گے کسی بھی طرح سے، سوائے اس بات کے جو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری تقدیر میں رکھ دی ہے۔ اور اگر وہ تمام کے تمام تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں کسی بات میں، تو وہ اس قابل نہیں ہوں گے، سوائے اس کے کہ جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے"۔

"قلموں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے (تقدیر کے بارے میں) اور کاغذ (کی سیاہی) خشک ہو چکی ہے (لوح محفوظ پر)"۔ (ترمذی)

آیت (۲۳)

"اس لیے تمہیں غمگین نہ ہونا چاہیے ان چیزوں کے بارے میں جنہیں حاصل کرنے میں تم ناکام ہو گئے ہو۔ اور نہ ہی تمہیں خوش ہونا چاہیے ان چیزوں پر جو تمہیں دے دی گئی ہیں (اللہ کی طرف سے) اور بے شک اللہ پسند نہیں کرتا مغرور اور اترانے والوں کو"۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کسی بھی نعمت یا خوشی پر نہ تو غرور کرو اور نہ ہی اتراؤ، کیونکہ وہ انعام اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اس کے حاصل کرنے میں تمہاری کسی دانش یا طاقت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اور نہ ہی تمہاری جدوجہد کی وجہ سے وہ چیز تمہیں ملی ہے۔ بلکہ تمہیں وہ نعمت اس وجہ سے ملی کہ وہ تمہارے واسطے لکھ دی گئی تھی اور اس کے لیے تمہاری جدوجہد بھی ضروری تھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ مغرور اور ناشکروں کو پسند نہیں فرماتا۔

چنانچہ یہ ضروری ہے کہ نعمت کے ملنے پر اللہ کا شکر اور اس کی حمد وثناء کر لی جائے۔ اور اس کے برعکس کسی بھی نعمت کے چھن جانے پر صبر اور شکر کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ عام طور پر لوگ اپنی محبوب چیز کے چھن جانے پر واویلا اور شکوہ کرتے ہیں، آہ و بکا کرتے ہیں، یہ نہایت نامناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں کو پسند نہیں فرماتے۔ بلکہ اللہ صبر اور شکر کرنے کو پسند بھی کرتے ہیں اور اس کا اجر بھی عطا کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ تغابن (۶۴) آیت (۱۱) میں فرمایا کہ:

”کوئی مصیبت نہیں آسکتی، بغیر اللہ کے اذن سے (یعنی جو اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں لکھ دیا) اور جو کوئی بھی اللہ پر ایمان رکھتا ہے، اللہ اس کے قلب کو ہدایت دیتا ہے (اللہ کے فیصلے کو قبول کرنے کے لیے) (بے شک) اللہ تعالیٰ ہر شے کا علم رکھتا ہے“۔

اس سے اگلی آیت (۱۲) میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے تابع ہو جائیں، فرمایا:

”اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو اس کے رسولؐ کی۔ لیکن اگر تم (ان کے احکامات سے) پھر جاؤ گے (تو نہ اللہ کا کچھ جائے گا نہ اس کے رسول کا) تو اللہ کے رسول کی ذمہ داری تو (اللہ کے حکم کو) پہنچا دینا ہے واضح طور پر“۔

جناب ابن عباسؓ نے مصیبت کے بارے میں فرمایا کہ ہر مصیبت جو کسی انسان پر آتی ہے وہ اس کی تقدیر میں لکھی ہوتی ہے اور جب کوئی شخص اپنی کسی مصیبت پر صبر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو اس کے نقصان کا نعم البدل عطا فرماتا ہے، جس سے اسے خوشی ملتی ہے۔

بخاری اور مسلم کی ایک حدیث کے مطابق عالی جناب رسول کریمؐ نے فرمایا:

”عجیب ہے ایسا مومن کہ جس کی تقدیر میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہوتی جو کہ اس کے لیے بہتر نہ ہو، اگر اسے کوئی مصیبت آتی ہے اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو وہ اس کے لیے بہتر ہوتی ہے اور اگر اس کے لیے کوئی خیر آتی ہے اور وہ اس پر شکر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ اور یہ آزمائش تو صرف ان کے لیے ہوتی ہے جو (اپنے رب کے) تابعدار ہوتے ہیں“۔

ایک مشہور صوفی بزرگ مولوی رومیؒ نے نظریہ جبر وقدر کے بارے میں لکھا ہے کہ:

جبر اور اختیار کی بحث علم کلام کی مشکل ترین بحثوں میں سے ایک ہے۔ ایک فرقہ اختیار کا منکر ہے اور جبر محض کا قائل ہے اور عقائد کی تاریخ میں جبریہ کے نام سے مشہور ہے۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر انسان مجبور محض ہوتا تو وہ اللہ کی طرف سے امر و نہی کا مخاطب کیوں بنتا، اور شریعت کے احکام اس کی طرف کیوں متوجہ ہوتے۔ کیا کسی نے پتھر کو بھی حکم دیتے سنا ہے؟

فرماتے ہیں:

جبریش گوید کہ امر و نہی راست
اختیار نیست ایں جملہ خطا است
جملہ قرآن امر و نہی است و وعید
امر کردن سنگ مرمر را کہ دید

مزید فرماتے ہیں کہ اختیار کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے اور وہ روزمرہ کی زندگی میں اس عقیدہ کا اقرار اور جبر کا انکار کرتا رہتا ہے۔ جب کسی پر چھت کی لکڑی گر جاتی ہے تو اسے چھت پر غصہ نہیں آتا۔ جب سیلاب سامان بہا لے جاتا ہے تو کسی کو اس پر غصہ کرتے نہیں دیکھا گیا۔ ہوا کسی کی پگڑی اڑا لے جاتی ہے تو کوئی ہوا سے نہیں لڑتا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ مجبور اور بے قصور ہے۔ البتہ انسان کے ساتھ انسان کا یہ معاملہ نہیں ہوتا، گویا کہ صرف وہی صاحب اختیار ہے۔

وہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر فرماتے ہیں کہ جانور تک جبر اور قدر کے مسئلہ سے فطری طور پر واقف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آلات اور جمادات کا کچھ قصور نہیں ہوتا۔ اگر کسی کتے کو بھی پتھر مارا جائے تو وہ پتھر پر نہیں لپکتا، بلکہ پتھر مارنے والے انسان کے پیچھے دوڑتا ہے۔ شتربان اونٹ کو جب لکڑی سے مارتا ہے تو اونٹ کو لکڑی پر غصہ نہیں آتا، بلکہ وہ شتربان سے انتقام لینا چاہتا ہے۔

لہٰذا جب حیوان تک اس حقیقت سے واقف ہیں تو انسان کو جبری بننے سے شرم نہیں آنی چاہیے۔ اور انسان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کس حد تک اپنی مرضی کا استعمال کر سکتا ہے اور کہاں پر وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ انسان کو جبر اور قدر کے اندر رہتے ہوئے اپنے لیے وہ راستہ اختیار کرنا ہوتا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے حتمی مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ کیونکہ دنیا کی زندگی ہر انسان کی آزمائش کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اس کی تابعداری واضح ہو جائے۔ اسی ضمن میں سورۃ الکہف (۱۸) کی آیت (۷) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"بے شک ہم نے بنایا ہے جو کچھ بھی ہے زمین پر، ایک زینت۔ اس لیے کہ ہم جانچیں ان لوگوں کو کہ ان میں سے کون ہیں اچھے اعمال کے حساب سے؟"۔

مطلب یہ کہ مال و دولت اور دیگر دل لبھائی اور عیش و عشرت کے اسباب انسان کی آزمائش کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، تاکہ ان میں سے منتخب کیے جائیں وہ لوگ جو تابعدار ہیں اللہ تعالیٰ کے۔

۹۔(ب) ہر شے القدر کے ساتھ پیدا کی گئی

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان (۲۵) کی آیت (۲) کے آخری حصے میں فرمایا کہ:

"اس نے پیدا کی ہر چیز ایک خاص انداز ے اور حساب کے ساتھ (یعنی تقدیر کے ساتھ)"۔

پھر سورۃ الاعلیٰ (۸۷) کی آیات (۱-۳) میں فرمایا کہ:

"تسبیح کر و اپنے رب کے نام کی جو سب سے اعلیٰ ہے"۔

"جس نے پیدا کیا اور پھر اسے ٹھیک ٹھیک پروان چڑھایا"۔

"اور جس نے اس کا حساب لکھا (اس کی زندگی کے متعلق) اور اسے ہدایت دی"۔

امام احمد بن حنبلؒ سے روایت ہے کہ جب آیت بالا (۱) نازل ہوئی تو عالیجناب رسول اللہؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ سجدہ کریں (اللہ کے حضور)۔

ابو داؤدؒ سے روایت ہے کہ جب نبی کریمؐ اس آیت کریمہ یعنی (۱:۸۷)

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ کی تلاوت فرماتے تو آپ اس کے جواب میں فرماتے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى،

کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے اس کے قواعد مقرر فرما دیے کہ وہ کیسے پیدا ہوگا اور پھر کس طرح سے اپنی زندگی گزارے گا۔ یہی تقدیر کے معنی میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان کی پیدائش سے پہلے ہی یہ طے ہو جاتا ہے کہ وہ کس ماں اور باپ سے پیدا ہوگا، لہٰذا یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے ماں اور باپ کا ملاپ ہو، یہی وجہ ہے کہ مرد کہیں رہتا ہے اور عورت کہیں۔ بعض اوقات ہزاروں میل کی دوری ہوتی ہے، لیکن ان کی زندگیوں میں ایسے حالات و واقعات رونما ہوتے ہیں کہ ان دونوں کا ملاپ ہو جاتا ہے اور پھر ان کے بطن سے پہلے سے طے شدہ اولاد پیدا ہوتی ہے۔

اسی لیے ہر شخص کے ماں باپ اور جگہ اور وقت پیدائش کا تعین کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس کی عمر کا تعین اور یہ کہ وہ کن کن ذرائع سے رزق حاصل کرے گا۔ اور کہاں کہاں خرچ کرے گا اور پھر جب اس کی لکھی ہوئی عمر پوری ہو جائے گی تو وہ کس جگہ، کس وقت اور کس حال میں فوت ہوگا اور مزید یہ کہ وہ کس جگہ دفن کیا جائے گا۔

ہر انسان کی زندگی میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ وہ کس طرح سے اپنا رزق کمائے۔ جس کے لیے وہ در بدر کی ٹھوکریں بھی کھاتا ہے، مشقت میں پڑتا ہے اور طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتا ہے، اور اس کے لیے وہ افسردہ ہوتا ہے، کبھی پریشان اور کبھی شکوہ کرتا ہے اور کبھی مایوس ہو جاتا ہے اور کبھی آس لگا بیٹھتا ہے۔ اس لیے صحیح مسلم میں امام مالکؒ سے روایت ہے کہ فرمایا جناب رسول کریمؐ نے کہ:

"اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو، اور اپنی کسی کمزوری کے سامنے ہتھیار مت ڈالو۔ اور جب تمہیں کوئی مصیبت آئے تو کہو کہ: "اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی لکھا تھا اور وہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے"۔ اور یہ مت کہو کہ اگر میں نے یہ کرلیا ہوتا تو یہ نہ ہوتا، کیونکہ یہ شیطان کے وسوسے سے ہوتا ہے۔ اگر آپ کی تقدیر میں ہوتا تو وہ کام ہو جاتا جو نہ ہوا۔ اور جو تقدیر میں لکھا تھا وہ ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو پیدا کرنے سے لے کر اسے موت دینے تک، اور پھر اسے قیامت کے روز زندہ کر کے حساب لینے کے بعد سزا اور جزا کا تمام پروگرام ان کی پیدائش سے پہلے ہی مرتب فرما کر لوح محفوظ میں درج کرلیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ ان کا مقصدِ حیات، ان کے پیدا ہونے کا وسیلہ اور ذریعہ اور پھر ان کی نشوونما کر کے پروان چڑھانے کا طریقہ اور ذریعہ اور پھر ان کی فزائشِ نسل کو بھی متعین کر دیا گیا ہے۔ نیز ان مخلوقات کی خواہشات، زندگی گزارنے کی ضروریات، ان کی صفات، طبع اور خصلت، ان کی اچھائی اور برائی کا مادہ، ان کی جان کی حفاظت کرنے کے طریقے اور اس کے لیے جدوجہد وغیرہ بھی ان کی زندگی کے پروگرام میں شامل کر دی گئی ہے۔

مثال کے طور پر درندوں کی صفت میں ہے کہ وہ کسی دوسرے جاندار کو قتل کر کے اپنی خوراک بنائیں، کچھ جانور سبزی خور ہیں، کچھ پرندے، کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں اور کچھ دانہ چگتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ان سب باتوں کو یا خواص کو ان کی جس یا جبلّت (Instinct) میں شامل کیا گیا ہوتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس انسان کو ان تمام مخلوقات سے نیارہ ادراک، عقل، دانش اور دانائی عطا کرنے کے بعد، (جو اس کی جبلّت میں رکھ دی گئی ہے)، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا فرمایا ہے، چھٹی حس یعنی (Intution) کے ذریعہ، اور اس کے بعد الہام کے ذریعے اپنے انبیا کے ذریعہ سے اعلیٰ ترین علم عطا فرمایا: لہٰذا انسان کا درجہ اس الہامی علم کی وجہ سے اور اس میں سوچنے اور سمجھنے کی طاقت کی وجہ سے تمام مخلوق میں اعلیٰ ترین ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنی منزل کے تعین کا حق بھی دے دیا کہ چاہے تو اچھا کردار

اپنائے یا غلط۔ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم ہے کہ اس کا بندہ انفرادی طور پر اور یہ کہ تمام بندے اجتماعی طور پر اپنے لیے کس طرح کے اعمال منتخب کریں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کے لیے ہمیشہ اچھائی ہی تجویز فرماتا ہے اور بُرائی سے منع کرتا ہے۔ لیکن اسے مجبور نہیں کرتا کسی بھی کام کے لیے۔ کیونکہ اگر وہ انسان کو کسی کام کے لیے بھی مجبور کرتا تو پھر وہ ان سے حساب کتاب لینے کا مجاز نہ رہتا۔

لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ انسان کچھ معاملات میں تو مجبورِ محض ہے اور کچھ میں وہ مختار ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ انبیا اس کی تربیت فرمائی اور اسے راہِ حق اختیار کرنے کی ترغیب دی تاکہ وہ اپنے لیے فلاح کا راستہ اختیار کرے اور ابلیس کے چنگل میں آ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب نہ ہو جائے۔ چنانچہ انسان کو اپنی ابدی زندگی منتخب کرنے کا پورا پورا اختیار مل گیا، اور اسی بنا پر اس سے اس کے اعمال کے متعلق پوچھ گچھ ہوگی۔

اس سلسلے میں سورۃ نجم (۵۳) کی آیات (۳۹) تا (۴۱) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی کہ اس نے کوشش کی ہوگی"۔

"اور اس کے اعمال جانچے جائیں گے (بروزِ قیامت)"۔

"اور پھر اسے بدلہ دیا جائے گا صحیح طور پر"۔

سورۃ الاعراف (۷) کی آیت (۴۳) میں فرمایا گیا کہ:

"اور اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہدایت نہ پا سکتے تھے"۔

اس سلسلے میں سننِ ترمذی میں ایک حدیث رقم کی گئی ہے کہ:

"جناب رسول اللہؐ نے عبداللہ ابن عباسؓ سے فرمایا کہ: میں تمہیں کچھ باتیں سکھا دیتا ہوں، پھر فرمایا کہ:

"اللہ کے حقوق کی حفاظت کر، اللہ تیری حفاظت کرے گا"۔

"اللہ کے دین کی حفاظت کر، تو اُسے اپنے پاس پائے گا"۔

"جب سوال کرے تو اللہ سے مانگ، اور جب مدد طلب کرے تو اللہ سے طلب کر"۔

اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانیں گے تو ان کی

یہی تقدیر ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں گے، دنیا اور آخرت میں۔ اور اس کے برعکس جو لوگ نافرمانی اختیار کریں گے، ان کی تقدیر یہی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہو اور انہیں ان کی نافرمانی کی سزا دے۔

اس سلسلے میں معروف عالم جناب ابوالحسن ندوی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے ایک قول ایک معروف صوفی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا کہ انہوں نے فرمایا کہ:

''جب بندہ کسی مصیبت میں مبتلا کیا جاتا ہے تو پہلے وہ خود اس مصیبت سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ نجات نہیں پا سکتا تو پھر مخلوقات میں سے کسی سے مدد چاہتا ہے۔ مثلاً حاکموں، امیروں، طبیبوں، پیروں سے۔ اور ان کے بعد ان لوگوں سے جو دنیا میں نہیں ہوتے (یعنی ان کے مزارات پر جا کر منتیں مانگتا ہے) جب ان تمام سے کام نہیں بنتا تو پھر اس کے بعد اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتا ہے، دعا سے، گریہ زاری اور حمد وثناء سے''۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بندے کو جب تک اپنے نفس سے مدد مل جاتی ہے اس وقت تک وہ خلق سے رجوع نہیں کرتا۔ اور جب خلق سے مدد مل جاتی ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اور پھر جب خلق کی طرف سے بھی کوئی مدد ملتی نظر نہیں آتی تو پھر بے بس اور لاچار ہو کر اللہ کے ہاتھوں میں آ رہتا ہے۔ اور کہتا ہے ''رَبِّهٗٓ اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (القمر ۵۴:۱۰) (اے میرے رب! میں لاچار ہو گیا ہوں، میری مدد فرما) اور اسی طرح سے سوال اور دعا، گریہ زاری کے ساتھ اظہار حاجت مندی کرتا ہے، ایک خاص امید لگا کر اللہ سے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے اس کی دعا سے بھی تھکا دیتا ہے، اور قبول نہیں کرتا، یہاں تک کہ اس کے کل اسباب منقطع ہو جاتے ہیں، اور وہ سب سے علیحدہ ہو کر رہ جاتا ہے تو پھر اس وقت اس پر احکام قضا وقدر کا نفاذ ہوتا ہے۔ اور اس کے اندر اللہ اپنا کام کرتا ہے۔ تب بندہ کل اسباب وحرکات سے بے پرواہ ہو جاتا ہے، اور اسے بفضل باری تعالیٰ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور وہ ضرور صاحب یقین موحد ہو جاتا ہے۔ اور جان لیتا ہے کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی حرکت اور سکون دینے والا ہے اور نہ ہی اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں اچھائی

اور برائی، نفع اور نقصان، بخشش اور ناامیدی، کشائش اور بندش، موت اور زندگی، عزت اور ذلت، غنا اور فقر۔ اس وقت احکام قضا وقدر میں بندہ اس حال میں ہوتا ہے، جیسے کہ شیر خوار بچہ دایہ کی گود میں، یا مردہ غسال کے ہاتھ میں یا پولو کی گیند سوار کے قبضہ میں کہ الٹا پلٹا جاتا ہے، اور بگاڑا بنایا جاتا ہے۔ اس میں اپنی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوتی نہ تو اپنے واسطے اور نہ ہی کسی اور کے لیے۔ یعنی بندہ اپنے مالک کے فعل میں اپنے نفس میں غائب ہو جاتا ہے اور اپنے مالک اور اس کے فعل کے سوا نہ کچھ دیکھتا نہ سنتا ہے، نہ کچھ سوچتا سمجھتا ہے۔ اور اگر دیکھتا ہے تو اُس کی صنعت، اگر سنتا ہے تو اُسی کا کلام، اور اس کے علم سے ہی ہر چیز کو جانتا ہے، اس کی نعمت سے لطف اٹھاتا ہے، اس کے قرب سے سعادت پاتا ہے اس کے وعدہ سے خوش ہوتا ہے، سکون اور اطمینان حاصل کرتا ہے۔ اس کی باتوں سے مانوس ہوتا ہے اور اس کے غیر سے وحشت اور نفرت کرتا ہے۔ اس کی یاد میں سرنگوں ہوتا ہے اور دل لگاتا ہے۔ اس کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے۔ اس کے نور معرفت سے ہدایت پاتا ہے اور اس کا خرقہ ولباس پہنتا ہے۔ اس کے علوم عجیب وغریب پر مطلع ہوتا ہے۔ اس کی قدرت کے اسرار سے مشرف ہوتا ہے۔ اس کی ذات پاک سے ہر بات سنتا اور اسے یاد رکھتا ہے اور پھر اس کی حمد وثناء اور شکر کرتا ہے''۔

۹۔ (ج) قدر پر ایمان کے مزید پہلو

القدر کے مزید تین پہلو بیان کیے گئے ہیں:

(i) العلم (ii) الکتاب (لوح محفوظ) (iii) مشیت

(i) العلم: اللہ تعالیٰ کا علم ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ان کے نہ ہونے سے ہونے تک۔ اور پھر ہونے سے نہ ہونے تک۔ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ جانتا ہے کہ کیا تھا، کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ اور اگر تھا تو کیسے تھا اور اللہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کی مخلوق، پیدائش کے بعد کیا کرے گی۔

سورۃ الحشر (۵۹) کی آیت (۲۲) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ عالم الغیب ہے اور عالم الشہود ہے یعنی ظاہر اور باطن کا جاننے والا۔

سورۃ الطلاق (۶۵) کی آیت (۱۲) میں بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے اور ہر شے پر قادر ہے اور اس کا علم ہر بات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

سورۃ الانعام (۶) کی آیت (۵۹) میں بیان ہے کہ:

"وہ ہر چیز کو جانتا ہے، جو ہے زمین پر اور سمندر میں۔ کوئی پتہ نہیں گرتا جسے وہ نہ جانتا ہو، اس نے لکھ رکھا ہے کتاب میں (لوح محفوظ میں) ہر بات کو۔

(ii) الکتاب (لوح محفوظ): اللہ تعالیٰ نے لکھ رکھی ہے تقدیر ہر اس کی جو وجود میں ہے یا آئے گا۔

سورۃ الحج (۲۲) کی آیت (۷۰) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"تم نہیں جانتے، بلکہ اللہ جانتا ہے، جو کچھ بھی ہے آسمانوں میں اور زمین پر۔ بے شک! یہ سب کچھ (لکھا ہوا گیا) ہے کتاب میں (لوح محفوظ میں)۔ بے شک! یہ اللہ کے لیے آسان ہے"۔

سورۃ الاسراء (۱۷) آیت (۹۶) میں فرمایا:

"کہو (اے محمدؐ)! اللہ کافی ہے گواہی کے لیے، جو (بھی) معاملہ ہے تمہارے اور میرے درمیان۔ بے شک! وہ ہمیشہ اپنے بندوں کے متعلق خبردار ہے اور جاننے والا ہے"۔

سورۃ یونس (۱۰) آیت (۶۱) میں فرمایا گیا ہے:

"نہ تم (اے محمدؐ!) کوئی عمل کرتے ہو یا قرآن میں سے کچھ تلاوت کرتے ہو۔ اور نہ ہی تم (اے لوگو!) کوئی کام کرتے ہو (اچھا یا برا)، ہمیں (اللہ کو) سب خبر رہتی ہے۔ اور کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے تمہارے رب سے ایک ذرّے کے برابر بھی۔ اور جو کچھ بھی ہے زمین اور آسمانوں میں، ہر چھوٹی بڑی بات لکھی گئی ہے کھلی کتاب (لوح محفوظ) میں"۔

(iii) مشیت: جو کچھ بھی ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ایک بات جان لینا ضروری ہے کہ چونکہ انسان کو اچھائی یا برائی منتخب کرنے کا پورا اختیار ہے۔ لیکن جب وہ اچھائی یا برائی کی طرف کامل طور پر جھک جاتے ہیں، یعنی اس کی طرف مائل ہو کر اس کے کرنے کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں، تو اس کام کے وارد ہو جانے کا حکم اللہ تعالیٰ کی

طرف سے صادر ہو جاتا ہے۔ اور وہ کام خواہ اچھا ہو یا برا سرزد ہو جاتا ہے۔

یہ بات اس طرح سے بھی کہی جا سکتی ہے کہ مرضی اور اختیار تو انسان کا ہوتا ہے اور جب انسان کا اختیار کی تکمیل کرنے کا مصمم ارادہ ہو جاتا ہے تو پھر اللہ کا حکم اس کام کے ہونے کے لیے ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے اچھے کام کرنے اور برے کام سے منع کیا ہے اس لیے انسان کو اس کی نافرمانی کی سزا اور فرمانبرداری کا انعام اللہ کی طرف سے ملتا ہے۔ اب یہ بات طے ہو گئی کہ انسان کوئی بھی کام نہیں کر سکتا جب تک کہ اللہ کا حکم صادر نہیں ہوتا۔ اسی لیے سورۃ کہف (۱۸) آیت (۲۳) میں فرمان ربی ہے کہ:

"اور کبھی بھی مت کہو کسی چیز کے بارے میں کہ میں کروں گا، اللاں اللاں کام کل کے روز"۔

پھر اس سے اگلی آیت (۲۴) میں فرمایا:

"سوائے (یہ کہتے ہوئے کہ)! اگر اللہ نے چاہا تو! اور یاد رکھو اپنے رب کو، اور جب تم بھول جاؤ تو کہو: ہو سکتا ہے کہ میرا رب ہدایت عطا فرمائے مجھے عنقریب اس سے زیادہ سچائی کے راستے پر"۔

فرمایا سورۃ التکویر (۸۱) آیت (۲۹) میں کہ:

"اور تم چاہ بھی نہیں سکتے، جب تک کہ اللہ نہ چاہے جو رب ہے سارے جہانوں کا"۔

یعنی کسی بھی شخص کو یہ سمجھنا نہ ہونا چاہیے کہ وہ تو بھلائی کر کے جنت کی منزل پا لے گا۔ کیونکہ اچھائی کرنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم درکار ہوتا ہے، تاکہ اس کا حکم ہو جائے، کیونکہ انسان تو صرف کامل ارادہ ہی کرنے کا مجاز ہوتا ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی ہے۔

فرمایا سورۃ الانبیاء (۲۱) آیت (۱۰۱) میں کہ:

"جن لوگوں کے لیے ہماری طرف سے اچھائی کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے، وہ اس سے (دوزخ سے) بہت دور کر دیے جائیں گے"۔

سورۃ توبہ (۹) آیت (۵۱) میں فرمان ربی ہے کہ:

"کہو! ہمیں کچھ بھی نہ ہو سکے گا، سوائے اس کے کہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے۔

وہ ہمارا مولا (مالک اور مدد کرنے والا) ہے۔ اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے مومنوں کو"۔

مشیتِ الٰہی کے عقیدے میں بہت سے لوگوں میں گمراہی کا عنصر پایا جانا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ یہ سوال ضرور کرتے ہیں کہ جب اچھائی اور برائی اللہ ہی کی مشیت سے ہوتی ہے تو پھر ہم کیا کریں؟ کیا ہم سب کام چھوڑ کر ایک طرف ہو جائیں؟ اس سوال کے بارے میں بخاری نے جناب علیؑ سے ایک روایت نقل کی ہے ایک حدیثِ نبیؐ کے متعلق:

فرمایا کہ جناب نبی کریمؐ ایک جنازے میں شریک تھے اور ایک جگہ بیٹھے ہوئے ایک لکڑی کے ٹکڑے سے زمین کرید رہے تھے۔ اسی دوران آپؐ نے فرمایا کہ:

"تم میں سے کوئی ایسا نہیں، جس کے لیے مقرر نہ کر دی گئی ہو جگہ جہنم یا جنت میں"۔

اس پر لوگوں نے کہا: "تو کیا ہم اس پر بھروسہ نہ کریں اور کام چھوڑ دیں"۔

آپؐ نے فرمایا: "اپنے کام جاری رکھو، کیونکہ ہر کوئی محسوس کرے گا آسان اس کام کا کرنا، جو اسے لے جائے گا اس کی مقررہ منزل تک، جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے"۔

اس کے بعد آپؐ نے سورۃ اللیل (۹۲) کی آیت (۵) تلاوت فرمائی:

"جس نے دیا (اللہ کی راہ میں) اور ڈرا (اپنے رب سے)"۔

اس آیتِ مبارکہ کو مزید سمجھنے کے لیے اگر ہم اسی سورۃ کو پوری طرح سے سمجھ لیں تو تقدیر کا مسئلہ کافی حد تک ہماری سمجھ میں آ سکے گا۔

سورۃ اللیل کا ترجمہ:

"قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے گی"۔(۱)

"اور قسم ہے دن کی، جب روشن ہو"۔(۲)

"اور قسم ہے اس ذات کی جس نے نر اور مادہ پیدا کیے"۔(۳)

ان تینوں آیات میں اللہ تعالیٰ نے تین طرح سے قسم اٹھائی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو ایک مرتبہ بھی قسم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ عمل اس لیے کیا گیا تا کہ قارئین قرآن کو اس بات پر یقین کامل بھی ہو جائے اور اس سورۃ کی اہمیت کو بھی مدنظر رکھیں اور یہی اللہ تعالیٰ کی سنت مبارکہ ہے کہ قرآن الحکیم میں کسی بھی ضروری اور اہم بات کے کہنے سے پہلے قسم

اٹھائی۔ لیکن یہاں پر تین مرتبہ قسم اٹھانے کا مطلب ہے کہ اس سورۃ مبارکہ پر شدید توجہ کی ضرورت ہے۔

اب اگلی آیات میں فرمایا گیا ہے کہ:

"یقیناً تمہاری کوشش اور اعمال مختلف قسم کے ہیں"۔(۴)

"جس نے دیا (اللہ کی راہ میں) اور ڈرا (اپنے رب سے)"۔(۵)

"اور نیک بات کی تصدیق کرے گا"۔(۶)

ان آیاتِ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اچھے اعمال کرتا اور کوئی برے۔ لہٰذا اسی طرح سے ان کا صلہ جنت اور یا دوزخ کی شکل میں ملے گا۔ اچھائی کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس کے بندے جنہیں اللہ تعالیٰ نے نوازا ہے وہ ان لوگوں پر خرچ کریں جو ضرورت مند ہیں اور جب کوئی شخص اس طرح کی اچھائی کی طرف اپنا دل لگاتا ہے تو پھر وہ برے کاموں سے خود بخود بچتا ہے۔ کیونکہ وہ یقین رکھتا ہے اس بات پر کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا بہت اچھا طریقہ ہے۔

اس سلسلے میں صحیح بخاری میں جناب ابوہریرہؓ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ فرمایا جناب نبی کریمؐ نے کہ:

"ہر روز دو فرشتے آسمان سے زمین پر اترتے ہیں، اور ان میں سے ایک کہتا ہے، اے اللہ! جزا عطا فرما ہر اس شخص کو جو خرچ کرتا ہے آپ کی خاطر۔ جبکہ دوسرا فرشتہ کہتا ہے، اے اللہ! برباد کر کنجوس کو (یعنی جو خیرات میں کنجوسی اور بخیلی سے کام کرتے ہیں)"۔

اس کے بعد اگلی آیات میں فرمایا گیا ہے کہ:

"تو ہم بھی اس کو آسان راستے کی سہولت دیں گے"۔(۷)

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ نیا رہ سے نیا رہ نیکیاں کر سکیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں نیکی اور اطاعت کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے۔

"لیکن جس نے بخیلی کی اور بے پروائی برتی (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے)"۔(۸)

"اور نیک بات کی تکذیب کی (یہ جملہ منکرین کے لیے کہا گیا ہے)"۔(۹)

"تو ہم بھی اس کی تنگی اور مشکل کے سامان میسر کریں گے"۔(۱۰)

"اس کا مال اسے (اوندھا) گرتے وقت کچھ کام نہ آئے گا"۔(۱۱)

"بے شک راہ دکھلانا ہمارا ذمہ ہے"۔ (اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن اور نبیؐ کے ذریعہ ہدایت فرمائی) (۱۲)

"اور ہمارے ہی ہاتھ آخرت اور دنیا ہے"۔(۱۳)

"میں نے تو تمہیں شعلے مارتی آگ سے ڈرایا ہے"۔(۱۴)

"جس میں صرف وہی بدبخت داخل ہوگا"۔(۱۵)

"جس نے جھٹلایا اور (اللہ کی پیروی سے) منہ پھیرا"۔(۱۶)

"یعنی جو لوگ خواہ کافر ہوں یا مسلمان، جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے احکامات سے منہ پھیرے گا وہی بدبختی کو دعوت دے گا"۔

"اور اس (جہنم) سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہوگا"۔(۱۷)

"جو پاکی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے (زکوٰۃ میں)"۔(۱۸)

"کسی کا اس پر احسان نہیں کہ جس کا بدلہ دیا جا رہا ہو (خیرات یا زکوٰۃ دے کر)"۔(۱۹)

"بلکہ اپنے پروردگار بزرگ و برتر کی رضا چاہنے کے لیے (خرچ کرتا ہو)"۔(۲۰)

"یقیناً وہ عنقریب رضامند ہو جائے گا (یعنی اللہ اس سے راضی ہو جائے گا، اور انعام دے گا۔ اور بندہ بھی اللہ سے راضی ہو جائے گا)"۔(۲۱)

۹۔(د) تقدیر اور موت

یہ بھی قدر یا مقدر کا حصہ ہے کہ ہر نفس کے لیے موت کا وقت اور قبر کی جگہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے متعین کی ہوئی ہے۔ ہر دور کا مسلمان جو اللہ کی راہ میں اس کے دشمن سے لڑائی کرتا ہے اسے یہ حتمی یقین ہوتا ہے کہ موت مقررہ وقت پر ہی آئی ہے، میدان جنگ میں آئے یا گھر کے بستر پر۔ بلکہ یہ تو ہر مسلمان کا عقیدہ ہونا چاہیے۔ بس انہیں اپنی موت کے لیے اپنی طرف سے تیاری کرتے رہنا چاہیے۔ وہ لوگ جو موت کے خوف سے میدان جنگ سے پیچھے رہ

جاتے ہیں ان کے واسطے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۵۴) میں حکم ربی ہے کہ:

"کہو (اے محمدؐ)! اگر تم اپنے گھر میں ہی رہتے ہوتے، وہ جن کے لیے قتل ہونا لکھ دیا ہے (تقدیر میں) تو وہ خود بخود اپنی قتل گاہ کی طرف چلے جاتے"۔

اس لیے مشاہدے میں آیا ہے کہ موت کا وقت قریب آنے سے پہلے خود بخود کسی نہ کسی بہانے لوگ اس جگہ منتقل ہو جاتے ہیں جہاں پر ان کا مدفن ہونا ان کے مقدر میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس معاملہ میں انسان مجبور محض ہے، اور اس کا اپنا ارادہ سلب کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے ہر انسان پر یہ واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور نبی علیہ رحمتؐ کے فرمودات پر اور احکامات پر عمل پیرا رہے اور جو بھی نتیجہ اس کی زندگی میں وارد ہو اسے بخوشی قبول کرے، اللہ تعالیٰ کی رضا سمجھ کر۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے تابعدار بندوں کو کبھی رسوا نہیں کرتا۔

سورۃ الجمعہ (۶۲) کی آیت (۸) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"کہو! کہ جس موت سے تم بھاگتے پھرتے ہو، وہ تو تمہیں پہنچ کر رہے گی، پھر تم غیب اور ظاہر کے جاننے والے (اللہ) کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور وہ تمہیں تمہارے کیے ہوئے تمام کام بتلا دے گا"۔

پھر سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۴۵) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"بغیر اللہ کے حکم کے کوئی نفس نہیں مر سکتا، مقرر شدہ وقت (موت کا) لکھا ہوا ہے۔ دنیا کی چاہت والوں کو ہم دنیا دے دیتے ہیں اور آخرت کا ثواب چاہنے والوں کو ہم وہ بھی دیں گے اور احسان ماننے والوں کو ہم بہت جلد نیک بدلہ دیں گے"۔

۹۔(ھ) نیک اور بد لوگوں کا مقدر

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کے اعمال کے ذریعہ جانچتا ہے، اور یہ دیکھتا ہے کہ اس کے بندے نے جو اچھے اعمال کیے ہیں کیا وہ خالصتاً اس کی رضا کے لیے کیے یا کہ دکھلاوے کے لیے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ تمام تر خلوص اعمال کا، جو اس کے حکم اور اس کی رضا کے لیے کیے جاتے ہیں ان کا اجر بڑھا چڑھا کر عطا کرتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس نافرمانوں کے لیے جہنم لکھ دیتا ہے اور یہی ان کی تقدیر ہے۔

اس سلسلے میں فرمایا رب تعالیٰ نے سورۃ ابراہیم (۱۴) کی آیت (۲۷) میں کہ:

"ثابت قدم رکھتا ہے اللہ، ان لوگوں کو جو ایمان لائے۔ اس قول کے ساتھ کہ ثابت قدم رہیں وہ اس دنیا کی زندگی میں اور آخرت کی زندگی میں۔ اور گمراہ کرتا ہے اللہ ظالموں کو (ایمان سے انحراف والوں اور برائی کرنے والوں کو) اور اللہ کرتا ہے جو بھی وہ چاہتا ہے"۔

امام ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ثابت قدم رکھتا ہے" کے بارے میں کہ موت واقع ہونے کے بعد منکر نکیر لوگوں سے تین سوال کریں گے:

(۱) تمہارا رب کون ہے؟ (۲) تمہارا دین کیا ہے؟ اور (۳) تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جو تمہاری طرف بھیجا گیا (جناب نبی کریمؐ)؟

تو ایمان والے اس کا جواب دیتے ہیں کہ: (۱) میرا رب اللہ ہے (۲) میرا دین اسلام ہے، اور (۳) محمدﷺ اللہ کے رسول ہیں، جو کھلی نشانیوں کے ساتھ ہمارے پاس بھیجے گئے، اور ہم ان پر ایمان لائے۔

جبکہ گناہ گار اور بے ایمان لوگ ان سوالات کا جواب دینے سے معذور رہتے ہیں۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں درج بالا بیان ابن کثیرؒ میں درج ذیل اضافہ کیا گیا ہے۔

"مومن جب فرشتوں کو جواب دے دیتا ہے تو فرشتے اسے جہنم کا ٹھکانہ دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی جگہ تمہارے لیے جنت میں ٹھکانہ بنا دیا ہے۔ پس وہ دونوں ٹھکانے دیکھتا ہے اور اس کی قبر ستر (۷۰) ہاتھ کشادہ کر دی جاتی ہے اور اسے نعمتوں سے بھر دیا جاتا ہے"۔

درج بالا سورۃ ابراہیم (۱۴) کی آیت (۳۱) میں ایمان دار بندوں کے لیے نصیحت فرمائی گئی ہے کہ: "کہو میرے ایماندار بندوں سے کہ قائم کریں الصلوٰۃ اور خرچ کریں اس میں سے جو ہم نے انہیں دے رکھا ہے پوشیدہ اور اعلانیہ۔ اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی اور محبت"۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی حمایت اور محبت حاصل کرنے کا ایک آسان نسخہ عطا فرما دیا ہے کہ وہ ادا کریں صلوٰۃ اور خرچ کریں اس کی راہ میں۔ اللہ تعالیٰ

جب اپنے بندوں کو خرچ کرنے کے لیے فرماتا ہے تو اس سے مراد مقررہ زکوٰۃ کی ادائیگی اور اس کے علاوہ اپنے اقربا، یتامیٰ اور مساکین وغیرہ کی مدد کرنا ہے۔

اس کے برعکس سورۃ الانعام (۶) کی آیت (۹۳) کے ایک حصے میں نافرمانوں کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ:

"اگر تم اس وقت دیکھو، جب یہ ظالم لوگ (نافرمان) موت کی سختیوں میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے (یہ کہتے ہوئے) نکالو اپنی جانوں کو، آج تمہیں ذلت کی سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم اللہ کے خلاف بولتے تھے اور انکار کرتے تھے، اس کی آیات کا، تکبر کے ساتھ"۔

نافرمانوں میں ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو کھلا کفر کرتے ہیں اور دوسرے وہ منافق لوگ ہوتے ہیں جو ہوتے تو کافر اور نافرمان، لیکن اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں ایمان والے۔ ایسے لوگوں کو کافروں کی نسبت زیادہ سزا ملے گی۔ اس ضمن میں سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۱۰۱) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور تمہارے درمیان کچھ کافر ہیں مدینہ والوں میں سے، جو نفاق یعنی منافقت پر اڑے ہوئے ہیں۔ آپؐ ان کو نہیں جانتے، ان کو ہم جانتے ہیں۔ ہم ان کو دہری سزا دیں گے۔ پھر وہ بڑے بھاری عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے"۔

مفسرین نے دہری سزا کے بارے میں لکھا ہے کہ پہلے تو انہیں دنیا میں ہی ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا، اور پھر بعد از موت ہولناک عذاب کا۔

ان کے برعکس سورۃ عنکبوت (۲۹) کی آیت (۶۹) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اور ان لوگوں کے واسطے جنہوں نے بہت جدوجہد کی اور مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہماری (اللہ) راہ میں، ہم یقیناً انہیں ہدایت دیں گے اپنے راستے (پر چلنے) کی۔ اور بیشک اللہ احسان کرنے والوں کا ساتھی ہے"۔

صحیح بخاری کے مطابق عالیجناب رسول کریمﷺ نے فرمایا کہ:

"سچائی راہ دکھاتی ہے البرّ کی، جبکہ البرّ راہ دکھاتی ہے جنت کی۔ جب ایک شخص سچائی

بیان کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک سچا شخص بن جاتا ہے اور اس کے برعکس جھوٹ راہ دکھاتا ہے اَلْفُجُوْر کا یعنی بُرائی کا۔ اور اَلْفُجُوْر راہ دکھاتا ہے جہنم کا۔ جب کوئی شخص جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ لکھا جاتا ہے جھوٹا (اللہ کے نزدیک)''۔

سورۃ یوسف (۱۲) کی آیت (۹۰) میں فرمایا گیا ہے کہ:

''بے شک وہ جو اللہ سے ڈرتا ہے اور اس کا تابعدار بن کے رہتا ہے اور ہے بھی صابر، پھر یقیناً اللہ محسنوں کا انعام ضائع نہیں فرماتا''۔

پھر سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۱۱۲) میں لفظ ''محسن'' کی تعریف کی ہے:

''ہاں! لیکن جو کوئی بھی فرمانبرداری سے جھک جاتا ہے اللہ کے سامنے، وہ ہے 'محسن'۔ اور اس کا انعام ہے اس کے رب کے پاس۔ ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم''۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لیے سورۃ آل عمران (۳) کی آیت (۱۷۱) میں فرمایا ہے:

''وہ خوش ہوں گے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے اور اللہ ضائع نہیں فرمائے گا ایمان والوں کا انعام''۔

تقدیر کے بارے میں صحیح بخاری میں ایک حدیث بیان کی گئی ہے جس کے راوی عبداللہ بن مسعودؓ ہیں اور اس کا متن ہے کہ: ''تم میں سے ایک شخص جو جنتی لوگوں جیسا کام کرتا ہے، یہاں تک کہ جنت اور اس میں ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی قسمت اس پر حاوی ہو جاتی ہے اور پھر وہ کوئی کام کرتا ہے جہنمی لوگوں جیسا، اور ہو جاتا ہے جہنم رسید''۔

اور اسی طرح سے تم میں سے کوئی عمل کرتا ہے جہنمی لوگوں جیسا، یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ لیکن پھر اس کی قسمت اس پر حاوی ہو جاتی ہے اور وہ کام کرتا ہے جنتی لوگوں جیسا، اور داخل ہو جاتا ہے جنت میں''۔

اس حدیث کو تلمبند کرتے ہوئے خود مصنف پر خوف طاری ہو گیا ہے اور اپنی بے بسی اور بے کسی کی وجہ سے مایوسی کے آثار بھی نمودار ہو گئے ہیں۔ اس لیے حدیث مبارکہ کی مزید تفصیل اور تشریح کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ جناب ابن القیمؒ نے اس

حدیث کو مثال بنایا صحیح احادیث میں سے۔ جو کہ لوگوں میں صحیح طور پر سمجھی نہیں گئیں۔ اس کے جواب میں جو نہایت غور طلب ہے کہا گیا ہے کہ یہ حدیث ان لوگوں کے لیے مثال ہے اور انہی لوگوں کے لیے بیان کی گئی ہے جو اپنے اعمال نیک نیتی، سچائی اور ایمان کے ساتھ ادا نہیں کرتے۔ یعنی جب وہ جنتی لوگوں جیسے کام کرتے ہیں تو اس طرح سے کرتے ہیں کہ لوگ ان کے اعمال کو ایسا سمجھیں۔ یعنی کہ وہ اپنے اعمال ایمان اور یقین کے ساتھ نہیں کرتے اللہ کے لیے، بلکہ دکھاوے کے لیے کرتے ہیں۔

پھر فرمایا ابن القیمؒ نے کہ اگر کوئی نیک عمل کرتا ہے، جو اللہ تعالیٰ قبول فرما لیتا ہے اور پھر اس سے محبت کرنے لگتا ہے اور اس کے اعمال ضائع نہیں کرتا۔ لیکن جب اس کے اعمال ضائع ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے اچھے اعمال صحیح طور پر ادا نہیں کیے۔ کہیں نہ کہیں ضرور کچھ غلط ہوا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خلوص سے کیے ہوئے اچھے کام کبھی ضائع نہیں فرماتا۔

ایسے لوگ جو اللہ کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں، اپنی عبادت اور فرمانبرداری کی وجہ سے، لیکن انہیں اپنے ساتھ گناہوں کی بہت فکر رہتی ہے اور وہ اس کے لیے معافی تلافی میں لگے رہتے ہیں اور آئندہ کے لیے بہت محتاط ہو جاتے ہیں کہ کہیں ان سے کوئی نافرمانی نہ ہو جائے۔ اس طرح سے ان کا خاتمہ بالایمان ہوتا ہے۔

ایمان والوں کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ ایمان سے غفلت نہ برتیں۔ بلکہ ہمیشہ تجدید ایمان کرتے رہیں اور ایمان کی حفاظت میں لگے رہیں، کیونکہ شیطان ہمیشہ ان کی تاک میں رہتا ہے کہ کسی طرح سے ان کے اعمال ضائع کرا دے۔

دوسری بات یہ کہ چونکہ انسان کی پوری زندگی، جس کے آخری لمحے کا اسے بالکل علم نہیں ہوتا، وہ محیط ہوتی ہے ایک ایسے امتحان پر جس کی کامیابی سے جنت اور ناکامی سے دوزخ ٹھکانہ بنتا ہے اور یہ ایسا امتحان ہوتا ہے جس کا طریقہ کار بھی عجیب ہوتا ہے۔ ایسا کہ انسان کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی امتحان میں داخل ہو چکا ہے اور اس کا امتحان بھی شروع ہو چکا ہے۔ خوشی میں بھی امتحان، غمی میں بھی امتحان۔ امیری میں بھی امتحان اور غریبی

میں بھی امتحان۔ صحت اور بیماری بھی امتحان۔ بندہ ہے کہ ہر وقت ایک نئے امتحان میں داخل ہو جاتا ہے اور اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔

ایک روایت کے مطابق کسی نے جناب علیؓ سے سوال کیا کہ وہ انتہائی مؤدب کے عالم میں رہتا ہے کیونکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تیر کے نشانے میں ہر وقت رہتا ہے، خواہ وہ کہیں بھی ہو اور کسی بھی وقت ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیوں کر اس تیر کی زد سے بچ سکے۔ اس کے جواب میں جناب علیؓ نے فرمایا کہ اس کا بہترین اور آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ تم تیر انداز کی قربت حاصل کر لو اور اس کے اتنے نزدیک آ جاؤ کہ تیر تمہارا نشانہ لے ہی نہ سکے۔

اس مثال کا مطلب یہ ہوا کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی اتنی قربت اختیار کر لے کہ بس اسی کا ہو جائے۔ یعنی اس کی ہمہ وقت تابعداری اور فرمانبرداری میں لگا رہے کہ شیطان کی دسترس سے محفوظ ہو جائے اور اللہ کے نزدیک آ جائے، بس اللہ اس سے پیار کرنے لگے گا اور اس کا محبوب بن جائے گا۔

۹۔ (و) تقدیر اور دُعا

جہاں تک تقدیر کے بدلنے کا تعلق ہے یہ ایک نہایت مشکل کام ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ اگر کوئی کہتا ہے کہ دعا سے تقدیر کا لکھا بدل سکتا ہے اور یہ بات کہنے والے کے مشاہدے میں آئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہونا بھی تقدیر میں تھا۔ جہاں تک دعا کا تعلق ہے تو یہ فعل اللہ تعالیٰ کے ہاں نہایت پسندیدہ ہے۔ کیونکہ دعا میں اللہ کا بندہ اپنے مالک کے سامنے عاجزی اور بے کسی اور بے بسی کا اظہار کرتا ہے، اور اپنے مالک کو ہی مختار کُل اور قادرِ مطلق مانتا ہے اور صرف اسی کو اپنا مددگار سمجھتا ہے۔

عالی جناب رسول کریمؐ کے ایک قول کے مطابق ''دعا عبادت کا مغز ہوتی ہے''۔ جناب رسول کریمؐ کے ایک اور قول کے مطابق ''تقدیر اور دعا، دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ جاتے ہیں''۔ جبکہ قدر اوپر سے نیچے اور دعا نیچے سے اوپر جا رہی ہوتی ہے۔ اس موقع پر ان دونوں میں سے جو بھی طاقتور ہوتا ہے وہ دوسرے پر حاوی ہو جاتا ہے''۔ اس

صورت میں عام طور پر تقدیر ہی طاقت کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے۔ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ دعا طاقت کا مظاہرہ کرے۔ جب دعا نہایت پُرسوز اور عاجزانہ ہوتی ہے تو تقدیر پر مؤثر انداز ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ اگر دعا اللہ تعالیٰ کے کسی محبوب کی ہو تو وہ پھر اپنے دیوانے کی بات نہیں ٹالتا، بلکہ اسے تقدیر پر حاوی کر دیتا ہے۔ لیکن ایسے دیوانے اور اللہ کے محبوب قسمت سے ہی ملتے ہیں۔

مسند احمد اور سنن ترمذی کے مطابق جناب رسول کریمؐ کا فرمان مبارک ہے کہ:

''تقدیر کو کوئی نہیں بدل سکتا سوائے دعا کے''۔

لہٰذا ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے اور اس کی بارگاہ میں نہایت عاجزی، انکساری اور بے کسی کی حالت میں مانگنا چاہیے۔ اس امید کے ساتھ کہ وہ ہماری دعا کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے گا۔

ایک ضروری بات یہ بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ ہم سے ہماری ماؤں سے بھی ستر (۷۰) گنا زیادہ محبت فرماتا ہے، اس لیے ہمیں اس کی ہر حال میں تابعداری اور شکرگزاری کرتے رہنا چاہیے اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے جو کچھ بھی پسند فرماتا ہے تو وہی ہمارے لیے بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے ضد کر کے اپنی پسند کی چیز مانگنے کی بجائے اُس سے اس کی رضا مانگنی چاہیے، اس سے اس کی محبت مانگنی چاہیے۔ اس سے اس کی قربت مانگنی چاہیے۔ کیونکہ مالک کی مرضی اور اس کی رضا میں عافیت ہوتی ہے۔

مستدرک حاکم کی ایک حدیث کے مطابق جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ:

''دعا ان چیزوں میں فائدہ مند ہوتی ہے جو ابھی نہ ہوئی ہوں۔ مصیبت آتی ہے، لیکن دعا اسے روکتی ہے''۔

اسی سلسلے کی ایک اور حدیث جو درج کی ہے امام احمدؒ، ابن حبان، الحاکم، ابن ماجہ وغیرہ نے کہ فرمایا جناب رسول کریمؐ نے کہ:

''کوئی چیز تقدیر کو نہیں بدل سکتی بجز دعا کے''۔

۹۔(ز) اقسامِ قدر و قضا

قدر و قضا کی دو اقسام بتائی گئی ہیں۔

(i) قضائے مبرم (قضائے قطعی)

(ii) قضائے معلق (قضائے مشروط)

قضائے قطعی تو تبدیل نہیں ہو سکتی، جبکہ قضائے مشروط کچھ شرائط کے ساتھ تبدیل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ایسی تقدیر وجوہات پر منحصر ہوتی ہے اور دعاؤں پر بھی۔ جیسا کہ سورۃ الرعد (۱۳) کی آیت (۳۹) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اللہ جو چاہے مٹا دے اور رہنے دے جو چاہے (لوح محفوظ میں سے) اور اسی کے پاس ہے اُم الکتاب (لوح محفوظ)"۔

امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ جناب عمر فاروقؓ دورانِ طوافِ کعبہ یہ دعا پڑھتے تھے:

"اے اللہ! اگر تُو نے مجھ پر بدبختی اور گناہ لکھا ہے تو اسے مٹا دے، اس لیے کہ تُو جو چاہے مٹائے اور جو چاہے باقی رہنے دے، تیرے پاس ہی لوح محفوظ ہے، پس تُو بدبختی کو سعادت اور مغفرت سے بدل دے"۔

جبکہ قضائے قطعی کے متعلق صحیح بخاری میں ایک حدیث منقول ہے کہ:

"جو کچھ ہونے والا ہے، قلم اسے لکھ کر خشک ہو چکا ہے"۔

قضا کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے فرمایا ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا اسباب کی وجہ کے ساتھ یعنی نظریہ (Cause & Effect) کے تحت۔ مطلب یہ کہ کسی ہونے کے واسطے کسی سبب یا اسباب کا ہونا لازم ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو فرمایا کہ وہ ان اسباب کو سمجھیں اور ان کے تابع رہیں، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقصدِ تخلیقِ آدم کے تحت زندگی بسر کر سکیں۔ جیسا کہ سورۃ الملک (۶۷) کی آیت (۲) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"جس نے موت اور حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے"۔

لہٰذا انسان کو یہاں پر مقصدِ حیات کے متعلق بتا دیا گیا ہے۔ اس لیے ہر ذی عقل انسان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ مقصدِ حیات پر پورا اترنے کے لیے اچھے کام کرے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اچھے کام ہیں جو افلاطون، سقراط اور ارسطو نے بتائے یا کہ ولیم شیکسپیئر، مولوی رومیؒ، اقبالؒ، مولوی مودودیؒ نے نہیں بتائے۔ بلکہ اچھے کام وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے اور اپنی الہامی کتب کے ذریعہ سے ہمیں بتائے ہیں۔ اور برے کام وہ ہیں جو ان کی ضد میں ہیں۔ یہ ایک بہت ہی آسان سا نسخہ ہے اپنے مالکِ حقیقی کے بتائے ہوئے مقصدِ حیات کو سمجھ لینے کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور انعام حاصل کرنے کے لیے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ صرف اللہ پر بھروسہ کر کے یا اس کو حقیقی خدا مان کر مقصدِ حیات حاصل کر لے گا تو یہ غلط ہوگا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ صرف مسلمان کہلوا کر مقصدِ حیات نہیں مل سکتا۔ بلکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصول اور قواعد کو اپنانا ہوگا۔

۹۔(ح) قدر اور فطرتِ انسانی

اللہ تعالیٰ نے انسان کا مقدر تو لکھ دیا، لیکن ساتھ ہی اسے اس بات کا اختیار بھی دے دیا کہ وہ اپنے لیے اچھائی یا برائی منتخب کرے۔ یہاں پر اسے جبر سے باہر نکال کر پورا اختیار دے دیا گیا ہے۔ وہ چاہے تو نیکی جنت یا بدی جہنم اپنے لیے منتخب کرے۔ لیکن یہ اختیار دینے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اسے فطری علم بھی عطا کر دیا۔ یعنی اس کی فطرت یا (Instinct) یا جبلت میں اچھائی کو ترجیح دینا رکھ دیا۔ پھر جب اس میں سوچ و بچار، جانچ اور پرکھ، اور اچھائی اور برائی میں تفریق کرنے کا علم یا سمجھ بوجھ آ گئی تو پھر اسے علمِ الہام سے بھی آراستہ کر دیا، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت خاص مانی جائے گی۔ اس کے بعد اسے تاکید اور تلقین بھی کر دی گئی کہ وہ اگر اچھائی اختیار کرے گا تو بھلائی کو پا لے گا، بصورتِ دیگر سزا کا حق دار ٹھہرے گا۔ اسی لیے قیامت کو برپا کیا جائے گا تاکہ لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق سزا اور جزا دی جا سکے۔

اس سلسلے میں سورۃ الشمس (۹۱) کی آیت (۱ تا ۱۰) کا مطالعہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فرمان مبارک شروع کرنے سے پہلے اپنے فرمان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اس سورۃ کی آیت (۱ تا ۷) میں بہت بڑی قسم اٹھائی ہے فرمایا:

(قسم ہے)

"سورج اور اس کی تمازت کی"۔(۱)

"چاند اور اس کی گردش کی"۔(۲)

"دن اور سورج کی روشنی کی"۔(۳)

"رات اور اس کے اندھیرے کی"۔(۴)

"آسمان اور اس کے فن معماری کی"۔(۵)

"زمین اور اس کے پھیلانے کی"۔(۶)

"نفس انسان اور اسے کمال عطا کرنے کی"۔(۷)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو یقین کی آخری حد تک لے جانے کے بعد فرمایا ہے بلکہ انسان کو بیدار کر لیا ہے کہ اس نے انسان کو پیدا فرمایا ایک خاص انداز سے اور ترتیب کے ساتھ، اور اس کی پیدائش، نشوونما کے ساتھ اسے علم عطا فرما کر درجۂ کمال تک پہنچا دیا ہے اور اس کے لیے زندگی گزارنے کے لیے چند قوانین بھی عطا کر دیے اور پھر انہی قوانین کو انسان کے لیے وجۂ ہدایت اور ذریعہ امتحان بھی بنا دیا۔

بخاری اور مسلم کی ایک روایت کے مطابق عالیجناب رسول کریمؐ نے فرمایا کہ:

"ہر انسان اپنی فطرت پر پیدا ہوا (فطرت کا مطلب یہ ہوا کہ اسے عاقل اور بالغ ہونے کے بعد اپنی عقل اور شعور کو استعمال کرتے ہوئے زندگی گزارنے کی فطرت عطا فرمائی) لیکن اس کے والدین اسے بنا دیتے ہیں یہودی یا عیسائی (یا کچھ اور)۔ جبکہ جانوروں کی صورت میں ان کا بچہ بغیر کسی عیب کے پیدا ہوتا ہے (کیونکہ) تم نہیں دیکھتے کسی جانور کو کٹے ہوئے کانوں کے ساتھ (پیدا ہوتا)"۔

ایک حدیث قدسی جو مسلم میں مذکور ہے، اس کے مطابق فرمایا جناب نبی کریمؐ نے کہ:

"میں نے پیدا کیا اپنے بندوں کو سچے ایمان کے ساتھ، پھر شیاطین ان کے پاس جاتے ہیں اور انہیں بہکاتے ہیں، سچے راستے سے"۔

آیت (۸)

"پھر اس نے دکھایا اُسے کہ اس کے لیے کیا غلط ہے اور کیا صحیح"۔

اس آیت کریمہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اچھائی اور برائی کے متعلق واضح کر دیا۔ لہٰذا اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اچھائی اور برائی میں فرق کرے۔ کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے اچھائی اور برائی میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا سلیقہ عطا کر دیا۔

ابن عباسؓ کے مطابق جسے روایت کیا ہے حریر ابوالاسود نے کہ اسے کہا عمران بن حصین نے کہ:

"مجھے بتاؤ کہ اگر لوگوں کے اعمال اور مشکلات جو وہ جھیل رہے ہیں، ان کی قسمت میں لکھے جا چکے ہیں اللہ کی طرف سے یا وہ اپنی مرضی سے کر رہے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہؐ کے آنے کے بعد ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے خلاف کوئی جواز نہیں رہتا۔ (یعنی یہ کہنا کہ ان کے اعمال اور مشکلات اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہو رہے ہیں)"۔

میں نے کہا (ابوالاسود نے) "نہیں! یہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں لکھے ہیں"۔

پھر عمران نے کہا: "تو کیا پھر یہ ناانصافی نہ ہوگی کہ انہیں ان کے اعمال کی سزا دی جائے"۔

میں (ابوالاسود) ایک دم کپکپا گیا خوف کے مارے اور کہا:

"خالق اور ہر شے کا مالک صرف اللہ ہے اور کوئی بھی اس کے کام کے بارے میں سوال کرنے کا مجاز نہیں ہے، لیکن وہ کسی سے بھی حساب لے سکتا ہے، کسی چیز کے بارے میں"۔

اس جواب سے وہ خوش ہوا اور کہا:

"میں نے تم سے یہ سوال صرف تمہیں جانچنے کے لیے کیا"۔ اس نے مزید کہا:

"ایک مرتبہ ایک بدو عرب نے جناب نبی کریمؐ سے یہی سوال پوچھا، تو آپؐ نے اسے یہی جواب دیا تھا جو آپ نے ابھی دیا ہے"۔

جب اس نے اعتراض کیا تو جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ:

"ہر کوئی پابند ہے وہ کام کرنے کا جو اسے لے جائے گا اس کی پہلے سے طے شدہ منزل

ہے، اگر وہ جنت میں جانے والا ہے تو وہ ایسے کام کرے گا جو اسے جنت میں لے جائیں گے۔ اور اگر وہ دوزخی ہوگا تو ایسے کام کرے گا جو اسے جہنم تک لے جائیں گے''۔

پھر اس نے درج بالا سورۃ الشمس کی آیات (۷) اور (۸) تلاوت کیں۔

آیت نمبر (۹) ''بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے آپ کو پاک کیا (یعنی اپنا تزکیہ کیا)''۔

آیت نمبر (۱۰) ''اور بے شک وہ ناکام ہوا جس نے اپنے آپ کو ناپاک کیا (برے اعمال سے)''۔

اس تمام بحث کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انسان کے لیے صرف اعمال صالحہ ہی اس کی کامیابی کا ذریعہ بنیں گے۔ اس ضمن میں سورۃ اعلیٰ (۸۷) کی آیات (۱۴۔۱۵) قابل غور ہیں۔ فرمایا گیا کہ:

''بے شک جس نے اپنا تزکیہ کیا وہ کامیاب ہوا، اور وہ جو ذکر کرتا ہوا اپنے رب کا اور ادا کرتا ہو صلوٰۃ''۔ (۱۴۔۱۵)

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو خوشخبری سنائی ہے جو اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور باقاعدگی اور خشوع اور خضوع کے ساتھ صلوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

ایک حدیث کے مطابق جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ:

''جو کوئی بھی شہادت دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی واحدانیت کی، اور اس کے علاوہ کسی اور کی پرستش نہیں کرتا، اور میری رسالت پر یقین رکھتا ہے اور روزانہ پانچوں وقت صلوٰۃ کی پابندی کرتا ہے (بے شک) وہ کامیاب ہوا''۔

امام احمد بن حنبلؒ سے روایت ہے کہ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ:

''ایک مرتبہ میں (رات کو) اٹھی اور رسول کریمؐ کو بستر پر نہ پایا۔ تو میں ان کو اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتی رہی، اور پایا آپؐ کو سجدہ کی حالت میں جب کہ وہ دعا مانگ رہے تھے:

''اے میرے رب! عطا فرما میرے نفس کو اس کی پاکیزگی۔ کیونکہ آپ سب سے اعلیٰ پاک کرنے والے ہیں۔ آپ اس کے نگران ہیں اور مالک''۔

۱۰۔ مسلمان اور مومن

مسلمان کا مطلب ہے تسلیم کرنے والا، جبکہ مومن کا مطلب ہے ایمان والا۔ ان دونوں کا درجہ ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مسلمان ہونا ایک ابتدائی درجہ ہے جبکہ مومن بننا انتہائی درجہ ہے ایمان کا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان بننے کے لیے کچھ زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتا۔ اور صرف ایک جملہ ادا کرنے سے کوئی بھی شخص مسلمان بن جاتا ہے، اور وہ جملہ ہے:

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

اس میں شک نہیں کہ اس جملے کو سمجھ کر زبان اور دل سے اقرار کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس چھوٹے سے جملے کو ادا کرنے کے بعد اس کی پاسداری کرنا پڑتی ہے۔ اور وہ انسان جو مسلمان بن جاتا ہے ایک بہت بڑی ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کولہو کے بیل کو نکیل ڈال کر کولہو کے گرد چکر لگانے کے لیے لگا دیا جاتا ہے، اسی طرح سے کلمہ بالا پڑھ کر انسان اللہ تعالیٰ کے احکامات کی نکیل اپنے ناک میں اور اس کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے اور پھر اپنی زندگی کا پورا راستہ ایسے ہی گزارتا ہے جیسا کہ اس کا مالک چاہتا ہے۔

افسوس صد افسوس! کہ مسلمانوں کی اکثریت اس جملے کی نہ تو پاسداری کرتی ہے نہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور نہ ہی اس کا حق ادا کرتی ہے۔ اس ضمن میں صوفی شاعر شیخ اقبالؒ نے فرمایا:

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

علامہ صاحبؒ ایک مسلمان کی ذمہ داریاں خوب سمجھتے تھے، اسی لیے انہوں نے فرمایا کہ مسلمان بننا اور پھر مسلمان کہلوانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک نہایت مشکل کام

ہے۔فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو مارے خوف کے مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ جملہ ادا کرنے کے بعد میں کن کن ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عہد کر رہا ہوں۔اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا یا نبھانا نہایت ہی مشکل کام ہے۔کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس چھوٹے سے جملے کو ادا کرنے کے بعد میں نے اپنے آقا اور مالک سے عہد کر لیا ہے کہ میں نے اس کی غلامی کا جوا اپنے گلے میں ڈال لیا ہے۔اس لیے میری زندگی کا ہر قدم مالک کی مرضی سے ہی اٹھے گا اور میں مانند ایک بیل اپنے مالک کے حکم کا منتظر رہوں گا اور پھر خاموشی اور خوشی کے ساتھ اس کا حکم بجالاؤں گا۔یہ مثال ہے ایک ایسے مسلمان کی جو اللہ تعالیٰ کی غلامی کا طوق پہن کر ایمان اور یقین کی منزلوں کو نہایت خوش اسلوبی سے طے کرتا ہے اور اس طرح سے اپنے مالک کا تابعدار بندہ بن کر اس کی خوشنودی حاصل کر لیتا ہے گویا کہ وہ مسلمان سے بندہ بن جاتا ہے اور اللہ کا بندہ بے شک مومن ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات (۴۹) کی آیت (۱۴) اور (۱۵) میں فرمایا ہے کہ:

"یہ دیہاتی (دیہاتی) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔تو کہو (اے محمدؐ) تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ 'ہم نے تابعداری قبول کر لی'۔حالانکہ ایمان تو ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کے تابع ہو جاؤ تو وہ (اللہ) تمہارے اعمال کے اجر میں سے کسی قسم کی کمی نہیں کرے گا، بے شک وہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔(۱۴)

"ایمان والے تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر کامل ایمان لائیں اور پھر کسی قسم کا شک وشبہ نہ کریں۔اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہیں، یہی ہیں سچے لوگ"۔(۱۵)

ان آیات کریمہ سے معلوم ہوا کہ ایمان بالعمل کا درجہ صرف مسلمان بننے سے بہت اعلیٰ ہے۔امام احمدؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے چند لوگوں کو کوئی چیز دی، لیکن ان میں سے ایک کو کچھ نہ دیا۔اس پر جناب سعدؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول!

آپؐ نے فلاں فلاں کو دیا لیکن فلاں کو کچھ نہ دیا، جبکہ وہ بھی ایمان والا ہے۔اس پر جناب رسول کریمؐ نے فرمایا: "بلکہ کہو! ایک مسلمان"۔

پھر اس کے بعد جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ:

"میں کچھ لوگوں کو کچھ دے سکتا ہوں اور دوسروں کو کچھ نہیں، حالانکہ دوسرے لوگ مجھے نیا وہ عزیز ہوں پہلے والوں سے۔میں ان کو نہیں دیتا اس خوف سے کہ کہیں وہ پھینک نہ دیے جائیں آگ میں اپنے منہ کے بل"۔

یہ حدیث مبارکہ بخاری اور مسلم دونوں نے درج کی ہے۔اس حدیث کے مطابق اللہ کے رسول نے تمیز اور تفریق فرمادی ایمان والوں اور مسلمانوں میں۔اور یہ باور کرا دیا کہ مسلمان ہونا ایک ابتدائی درجہ ہے ایمان کا۔جبکہ اس کی نسبت مومن کا درجہ اعلیٰ اور کامل ہے اور مسلمان بننے کی تکمیل ہے۔کیونکہ ایک کامل اور مکمل مسلمان ہی مومن ہوتا ہے۔

چنانچہ تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ وہ صرف مسلمان بننے تک اپنے آپ کو محدود نہ رکھیں، بلکہ اپنے مسلمان ہونے کو کمال کے درجہ تک پہنچا کر مومن کے درجے پر لے آئیں۔اور یہ اس وقت تک ممکن نہ ہوگا جب تک کہ مسلمان غفلت اور گمراہی کی زندگی چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات پر صدق دل سے عمل پیرا ہو جائیں۔

۱۱۔غرور اور تکبر ایمان کی نفی کرتے ہیں

اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء (۴) کی آیت (۳۶) کے آخری حصے میں فرمایا ہے کہ:

"بے شک اللہ پسند نہیں فرماتا تکبر کرنے والے شیخی خوروں کو"۔

غرور اور تکبر تو انسان کو زیب ہی نہیں دیتے، کیونکہ یہ خواص اس کی اوقات سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ یہ رویہ تو صرف اس ذات پاک کو زیب دیتا ہے جو تمام جہانوں کا خالق ہے، مالک ہے اور وہ ہر شے پر حکمرانی کرتا ہے۔ اور ہر شے اس کی محتاج ہے۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں فرمایا جناب رسول کریمؐ نے کہ:

"وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی کبر ہوگا"۔

کیونکہ متکبر شخص نہ تو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالاتا ہے اور نہ ہی اللہ کی مخلوق سے محبت کرتا ہے، کیونکہ وہ حسنِ سلوک سے عاری ہوتا ہے۔

سورۃ لقمان (۳۱) کی آیت (۱۸) میں فرمایا گیا کہ:

"لوگوں کے سامنے اپنے گال نہ پھلا اور زمین پر اکڑ کر نہ چل، اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا کسی تکبر کرنے والے شیخی خورے کو"۔

اسی موضوع پر سورۃ الکہف (۱۸) کی آیات (۳۲ تا ۴۴) میں واقعہ بیان کیا گیا ہے دو اشخاص کا، جن میں ایک تو فرمانبردار ہے اللہ تعالیٰ کا۔ جبکہ دوسرا نافرمان و متکبر۔ نافرمان امیر ہے اور اس کے باغات ہیں پھل دار درختوں کے۔ جبکہ فرمانبردار اس سے کمتر ہوتا ہے۔ کسی موقع پر دونوں کے مکالمات ہوتے ہیں جس میں متکبر شخص اپنے غریب ساتھی کے ساتھ نہایت تکبر کے ساتھ اپنی امارت اور پھلوں سے بھرے باغ کا ذکر کرتا ہے اور یہی نہیں بلکہ وہ امید کرتا ہے کہ آخرت میں بھی وہ اچھا مقام پائے گا اور اسی وجہ سے وہ اپنے مالک کی نعمتوں کی ناشکری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

چنانچہ اگلے روز ہی وہ اپنے انجام کو اس طرح سے پہنچتا ہے کہ جب وہ اپنے باغ میں داخل

ہوا تو ششدر کے رہ گیا۔ اور سمجھا کہ وہ کسی غلط جگہ آ گیا ہے، کیونکہ وہ جگہ تو بنجر اور ویران تھی، بلکہ اس طرح سے کر دی گئی تھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کی وجہ سے اور وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا، اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے۔ اس کے عمل اور ناشکرے پن اور تکبر نے عملی طور پر ایمان کی نفی کر دی۔

اللہ تعالیٰ نے ہماری ہدایت کے واسطے ابلیس، آدم اور فرشتوں کے واقعات کو تفصیل سے اس لیے بیان فرمایا کہ انسان ان واقعات سے سبق لے۔ یعنی ابلیس جس کو اس کی فرمانبرداری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جنات کی جگہ سے اٹھا کر فرشتوں کے ساتھ جگہ عنایت کی، جو کہ اس کی معراج تھی۔ لیکن ابھی اس کا امتحان ہونا باقی تھا۔ سو اس بد بخت نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے ذلیل اور رسوا کر لیا۔ اس کی نافرمانی کی وجہ اس کی جہالت اور غرور و تکبر تھا۔ اس لیے انسان کے لیے سبق ملتا ہے کہ وہ کبھی بھی اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور نہ ہی غرور اور تکبر کرے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی جہالت دور کرے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کامل علم اور استاد محترمؐ عطا فرما دیے۔

ابلیس کے برعکس آدمؑ نے اپنی غلطی پر اپنی انتہائی ندامت کا اظہار کیا اور وہ معافی کا خواستگار ہوا جس کی وجہ سے اور اس علم کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا وہ فرشتوں سے بھی اعلیٰ مقام پا گیا۔ اس لیے آدم کی اولاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آباء کے نقشِ قدم پر چلیں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جو لوگ ابلیس کے راستے پر چلے اور جو آج بھی اس کے راستے پر چل رہے ہیں جہالت اور غرور سے بھرے ہوئے ان کا انجام ابلیس جیسا ہی ہوا۔ اس کی تفصیل تو یہاں بیان نہیں کی جا سکتی لیکن مثال کے طور پر ان میں سے چند کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً فرعون، نمرود، قارون، جناب نوحؑ کا بیٹا، جناب ابراہیمؑ کے والد، عالیجناب رسول کریمؐ کے عزیز ابولہب اور ابوجہل وغیرہ۔ دورِ حاضر کی تاریخ ہمیں ان حکمرانوں کے متعلق بتاتی ہے جن کا انجام نہایت ذلت آمیز اور عبرتناک ہوا جیسا کہ گزری ہوئی تاریخ کے حکمرانوں کا ہوا تھا، ان کے ظلم اور نافرمانیوں کی وجہ سے۔ لہٰذا ہمیں آج کے دور سے بھی اور گزرے ہوئے دور سے بھی سبق سیکھنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے تابعدار بن کر زندگی گزارنی چاہیے۔

۱۴۔ ایمان بت پرستی کی نفی اور مذمت کرتا ہے

جیسا کہ بتلایا جاچکا ہے کہ ایمان اس عقیدے کا نام ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو کلی طور پر قبول کر کے اس پر کامل طریقے سے عمل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا نہ تو اس کا کوئی شریک ٹھہرایا جائے اور نہ ہی مددگار۔ خواہ وہ کسی بھی انداز سے کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ بت پرست کہتے ہیں کہ وہ ان بتوں کے وسیلے سے اللہ تک پہنچتے ہیں۔ یا ایسے لوگ جو برگزیدہ بندوں، انبیاء یا فرشتوں سے اللہ تعالیٰ کو سفارش کرنا چاہتے ہیں یا ان کا واسطہ دے کر اللہ سے مانگتے ہیں۔ یہ سب باتیں غلط ہیں، کھلا شرک ہیں اور ایمان کی نفی کرتے ہیں۔ جبکہ ایمان ان تمام باتوں کی شدید مذمت کرتا ہے۔

ایمان والوں پر کسی طور پر بھی جائز نہیں کہ وہ ماسوا اللہ تعالیٰ کے کسی اور سے حاجت روائی کریں اور نہ ہی کسی غیر اللہ کو اللہ تعالیٰ سے سفارش کا ذریعہ سمجھنا جائز ہے۔ قرآن الحکیم کی سورۃ البقرہ (۲) کی آیت (۲۵۵) آیت الکرسی میں فرمایا گیا ہے کہ "کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے"۔ حتیٰ کہ روزِ قیامت لوگ اپنے اپنے انبیاء کے پاس جائیں گے اور ان سے سفارش کے لیے کہیں گے، لیکن کسی کی جرأت نہ ہوگی کہ وہ صاحب ذوالجلال والاکرام کے سامنے اپنی زبان کھول سکیں۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ جناب نبی کریم ﷺ کو اجازت دیں گے سفارش کی اور وہ بھی ان لوگوں کی سفارش جن کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا اظہار ہو جائے گا۔ آج کے دور میں بھی نظریۂ سفارش عام ہے، خاص طور پر غیر عرب ممالک مثلاً ترکی، ایران، افغانستان، پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش وغیرہ میں اولیاء کرام کی قبور پر لوگوں کا اژدہام لگا رہتا ہے۔ لوگ وہاں جا کر منتیں مانگتے ہیں، اپنی مشکلات بیان کرتے ہیں، یہ سمجھ کر کہ وہ ان کی حاجت روائی کریں گے۔ اس طرح سے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دعا کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا رد نہیں فرمائے گا۔ یہی

اعمال شرک کہلاتے ہیں اور ایمان ان کی نفی بھی کرتا ہے اور مذمت بھی۔ یہی تمام باتیں بعثتِ نبویؐ کے وقت بھی جزیرۃ العرب میں عام تھیں، جس کی مذمت اور مخالفت جناب نبی کریمؐ نے کی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی قوم اور ان کے گھر والے ان کے ایسے خلاف ہوئے کہ آپؐ کے قتل کا فیصلہ کر لیا۔ ایک مرتبہ کفارِ مکہ طواف کے دوران نبی مکرمؐ کو دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ کس اللہ کی بات کرتا ہے، جسے ہم تو اللہ کو مانتے نہیں۔ یہ دیکھو ہمارا اللہ تو یہاں موجود ہے۔ یہ بات انہوں نے اس بت کی طرف اشارہ کر کے کہی جسے وہ اللہ کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کی اس بات پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ اخلاص (قل ہو اللہ) کا نزول فرمایا اور انہیں بتا دیا کہ یہ بت اللہ نہیں بلکہ اللہ یہ ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو متعارف کرایا اس سورت مبارکہ میں:

اسی لیے دینِ اسلام میں داخلے کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ ماسوا اللہ تعالیٰ کے تمام تر معبودوں کی نفی کر کے ان سے لاتعلقی کی جائے۔ یعنی ایک مسلمان کو مسلمان بننے کے لیے سب سے پہلے "لا الٰہ" (یعنی کوئی نہیں ہے معبود) کے اقرار سے ہوتی ہے۔ اور پھر معبودِ برحق کا اقرار کیا جاتا ہے اور پھر اس ذاتِ عالیشان کی صفات کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ نجم (۵۳) کی آیات (۱۹) تا (۲۳) میں بتوں کی اور بت پرستوں کی شدید مذمت کی ہے۔ فرمایا:

"کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا"۔ (۱۹) یہ عرب کے مشہور بت تھے۔

"اور منات، تیسرے پچھلے کو"۔ (۲۰)

"کیا تمہارے لیے لڑکے اور اللہ کے لیے لڑکیاں"۔ (۲۱)

عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، جو نہایت بے ادبی کی بات تھی۔

"یہ تو بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے"۔ (۲۲)

"دراصل یہ صرف نام ہیں، جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ان کے لیے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اُتاری۔ یہ تو صرف ایک خیالی تصور اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور یقیناً ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس

ہدایت آ چکی ہے''۔(۲۳)

خطہ حجاز میں تین بڑے بت خانے تھے۔لات کا مندر طائف میں تھا، اور عزیٰ کا مندر مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ کے مقام پر تھا۔ جبکہ منات کا مندر قدید کے مقام پر جو مدینہ اور بحیرہ احمر کے درمیان تھا۔ اہل مدینہ اس کا طواف کرنے ہر سال آتے تھے۔ان کے زیادہ تر بت فرشتوں کے خیالی ناموں پر تھے اور یہ سب مؤنث نام تھے۔اور مشرکین انہیں (نعوذ باللہ) اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔اور اس خیال سے ان کی پرستش کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے سفارش کریں گی۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اس بکواس کو نہایت ناگواری کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند یہی بات ہے کہ اس کے ساتھ کسی کی بھی شراکت کی جائے۔اس لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ شرک کو کبھی معاف نہ کرے گا۔لہٰذا ایمان کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ تمام خداؤں کی نفی کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی واحدانیت کا اقرار کیا جائے۔

حجاز کے عرب بت پرستی میں اتنے بے وقوف ہو گئے تھے کہ کسی بھی نیک شخص کی قبر کو پوجنا شروع کر دیتے۔اس سلسلے میں عبداللہ بن عباسؓ کا فرمانا ہے کہ لات ایک شخص کا نام تھا جو پانی میں ستو ملا کر حاجیوں کو پلایا کرتا تھا۔ جب وہ فوت ہو گیا تو لوگوں نے اس کی قبر کے پاس آ کر اس کی پوجا شروع کر دی۔

نسائی میں ایک حدیث ابوطفیلؓ کی روایت سے نقل کی گئی ہے کہ جب عالیجناب رسول اللہؐ نے مکہ فتح کیا تو آپؐ نے خالد بن ولید کو نخلہ کے علاقے میں بھیجا۔ جہاں عزیٰ نامی بت تین درختوں پر رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ خالد بن ولید نے ان تینوں درختوں کو کٹوا دیا اور ان پر رکھے بت کو تباہ کر دیا۔ اور اسی طرح سے عرب کے تمام بت خانے مسمار کر دیے گئے اور بتوں کو تباہ کر دیا گیا۔

لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بت پرستی یا قبر پرستی ایمان کو برباد کر دیتی ہے۔کیونکہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا یا ان سے حاجت روائی کرنا یا ان سے سفارش کرنا سب ناجائز ہے، اسے اللہ اور

اللہ کے رسول نے منع فرمایا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کو اس بات پر غصہ آتا ہے اور اس سے شدید نفرت بھی ہے۔

مسلمان جب دن میں پانچ مرتبہ اللہ تعالیٰ کی حضوری میں حاضری دیتا ہے تو سب سے پہلے اللہ کی حمد و ثناء کرتا ہے اور پھر آخر میں حاجت روائی کرتا ہے، اپنے دکھ درد اللہ تعالیٰ سے بیان کرتا ہے اور اس سے مدد چاہتا ہے، پس یہ دعا خالص مسلمانوں کے لیے ہے۔لہٰذا تمام وہ لوگ جو غیر اللہ سے حاجت روائی کرتے رہے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ کر آئندہ کے لیے توبہ کر لینی چاہیے ورنہ بصورت دیگر ان کا ایمان قائم نہیں رہتا۔

۱۳۔ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا ظلمِ عظیم ہے

دنیا کے بیشتر مذاہب کے پیروکار اللہ تعالیٰ کو رب تو مانتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ کے ساتھ اس کے شریک بھی ٹھہراتے ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ اس بات سے نفرت فرماتے ہیں اور اسے ظلمِ عظیم قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا اکیلا خالق ہے اور اکیلا ہی مالک ہے اور صرف وہی اپنی تمام مخلوق کی حاجت روائی بھی فرماتا اور اس کا نگہبان بھی ہے۔

اگر کسی مشرک سے یہ پوچھا جائے کہ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ تو کہتے ہیں اللہ نے۔ اگر ان سے پوچھا جائے یہ دنیا اور آسمان کس نے بنائے؟ تو کہتے ہیں اللہ نے۔ اگر ان سے پوچھیں کہ تمہیں موت کون دیتا ہے؟ تو کہتے ہیں اللہ۔ لیکن ان کی بے وقوفی کا کیا کہیے کہ پھر بھی اللہ کے شریک ٹھہراتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اللہ کا بیٹا ہے، کوئی اللہ کی بیٹیاں بتاتا ہے، اور کوئی اہلِ قبور سے مانگتے جاتے ہیں، انہیں پکارتے ہیں جو ان کی پکار کو سن ہی نہیں سکتے۔ کبھی وہ اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کو پکارتے ہیں، حالانکہ جب ان بتوں کے منہ پر مکھیاں بیٹھ کر گندگی کرتی ہیں تو وہ بت ان مکھیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو بھلا ان بے وقوفوں کی پکار کو کیا سنیں گے اور ان کی کیا مدد کریں گے۔

جب کبھی ان عقل کے اندھوں کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے اور موت سامنے نظر آ رہی ہوتی ہے، مثلاً آندھی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا یا سمندر کے بیچوں بیچ جب ان کا جہاز طوفان کی زد میں آ کر ایک تنکے کی طرح ہل رہا ہوتا ہے تو اس وقت ایسے مشرک لوگوں کو کوئی دیوتا یا دیوی یا وہ جن کو وہ پکارا کرتے تھے کوئی بھی یاد نہیں رہتا۔ بلکہ اس شدید خوف اور اضطراب کے عالم میں صرف اللہ کو ہی پکارتے ہیں۔ لیکن ان کی جہالت کا کیا کہیے کہ جیسے ہی موت کا خطرہ ٹل جاتا ہے اور وہ خوفناک لمحات گزر جاتے ہیں تو وہ پھر سے اپنے ناخداؤں کو یاد کرنے لگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ یوسف (۱۲) کی آیت (۱۰۶) میں فرمایا ہے کہ:

"اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں لاتے، اس کے ساتھ کرو بناتے ہیں اس کے شریک"۔

اس آیت کریمہ کے متعلق جناب ابن عباسؓ نے فرمایا کہ:

"یہ لوگ ایمان کا ایک حصہ رکھتے ہیں، جب انہیں کہا جاتا ہے کہ کس نے بنائے آسمان؟ تو وہ کہتے ہیں "اللہ نے"۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ اللہ کے شریک ٹھہراتے ہیں"۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورۃ لقمان (۳۱) کی آیت (۱۳) میں کہ:

"اور کہا لقمان نے اپنے بیٹے کو: اے میرے بیٹے! عبادت میں مت شریک کرو کسی کو بھی اللہ کے ساتھ۔ بے شک دوسروں کو اللہ کے ساتھ عبادت میں شریک کرنا بہت بڑا ظلم ہے"۔

احمد، ترمذی اور حمیدی کے حوالے سے ایک روایت منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریمؐ سورۃ توبہ (۹) کی آیت (۳۱) تلاوت فرما رہے تھے جس میں کہا گیا ہے کہ "اہل کتاب نے اپنے علما کو اپنا رب بنا لیا، اللہ کے سوا"۔

تو اس وقت عدی بن حاتم نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! وہ ان کی عبادت نہیں کرتے، اس پر اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: "بے شک وہ کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے بنا لیا جائز کہنا جائز اور ناجائز کو جائز۔ اور انہوں نے ان کی تقلید کی، اور ایسا کرنے سے انہوں نے حقیقت میں انہی کی پرستش کی"۔

صحیح مسلم اور بخاری کی ایک روایت کے مطابق جناب عبداللہ بن مسعودؓ نے بیان کیا کہ: "میں نے کہا، اے اللہ کے نبیؐ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟

آپ نے فرمایا "وہ جسے تم اللہ کے مقابلے میں لاتے ہو، جبکہ اس نے تمہیں خود اکیلے ہی پیدا کیا"۔

شرک کی جو مثالیں ذکر کی گئی ہیں وہ تو ہیں واضح شرک کی مثالیں۔ لیکن اس کے علاوہ شرک خفی بھی ہوتا ہے۔ یہ ان لوگوں میں بھی ہوتا ہے جو ایمان والے ہوتے ہیں، ایسا شرک بہت زیادہ ہوتا ہے، لیکن اس کے مرتکب لوگ اس سے بے خبر ہوتے ہیں اور انہیں یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ شرک کر رہے ہوتے ہیں۔

امام ابن کثیرؒ نے ایک روایت کے حوالے سے بیان کیا کہ: حماد بن مسلم نے بیان کیا

کہ عاصم بن ابی نجود نے کہا کہ عروہ نے کہا کہ:

"حذیفہ نے ایک بیمار کی خبر گیری کی، اور دیکھا کہ اس کی کلائی پر ایک ڈوری بندھی ہوئی ہے۔ جسے اس نے کھول دیا اور ساتھ ہی سورۃ یوسف کی آیت (۱۰۶) تلاوت کی، جو اس مضمون کے شروع میں بیان کی گئی ہے۔

ترمذی میں ایک حدیث جناب ابن عمرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ فرمایا جناب رسول کریمؐ نے کہ جو کوئی بھی قسم اٹھاتا ہے اللہ کے سوا، وہ شرک کرتا ہے۔

امام احمد و داؤد نے نقل کی ایک حدیث جسے روایت کیا جناب عبداللہ بن مسعودؓ نے اور کہا کہ فرمایا جناب رسول کریمؐ نے کہ:

"بے شک 'الرُّقیٰ' 'التَّمائم' اور 'التِّوَالَة' شرک ہیں۔

الرُّقیٰ: جادو وغیرہ کے منتر پڑھنے کو کہتے ہیں۔

التَّمائم: گردن کے گرد تعویذ پہننے کو کہتے ہیں۔ (نظر بد سے بچنے کے لیے)

التِّوَالَة: ایسے عمل کو کہتے ہیں جو جادو ہوتا ہے اس لیے کہ کسی عورت کو اس کا خاوند زیادہ چاہے۔

شرک کی ان اقسام کو خفیہ شرک کہا گیا ہے۔

نوٹ:۔ مصنف کا خیال ہے کہ قرآنی آیات کا ورد کرنا یا انہیں لکھ کر گھر میں لٹکانا یا کسی فرد کا اپنے پاس رکھنا شرک کے زمرے میں نہیں آتا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے کسی مراد کے بر آنے کی امید صرف اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ سے ہی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں شرک ظاہر یا خفی ایسے افعال ہیں جن میں کسی بھی طریقے سے غیر اللہ کی مدد مانگی جائے۔

۱۴۔ مجرمین کا انجام

اللہ تعالیٰ کی نظر میں مجرم تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مسلمان تو ہو جاتے ہیں لیکن مسلمان بننے کی عام شرائط کو قبول کر کے ان پر کمال حاصل نہیں کرتے۔ اس لیے مومن نہیں بن پاتے۔ لیکن وہ شرک سے اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ روزِ قیامت اپنی سزا پوری کریں گے اور جب ان کی سزا پوری ہو جائے گی تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف کر دیں گے اور داخل جنت کر دیں گے۔ لیکن یہ بھی بڑی خوفناک بات ہے لہٰذا اس پر بالکل خوش ہونا چاہیے کہ انہیں سزا کے بعد نجات مل جائیگی اور نہ ہی بے خبری کے عالم میں اپنی زندگی بسر کر لی چاہیے۔ کیونکہ جہنم کو دیکھنا تو درکنار اس کا نام ہی سن کر اللہ کا بندہ اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔ چہ جائے کہ جہنم کی کربناک اور اذیت ناک جگہ پر رہنا اور وقت گزارنا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو سرے سے اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری کرتے ہی نہیں۔ اللہ کو مانتے ہیں لیکن اس کا حکم نہیں مانتے۔ اور اس کے شریک ٹھہراتے ہیں، اس کے رسولوں کے احکامات نہیں مانتے بلکہ ان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اور ان کی بھرپور مخالفت کرتے ہیں۔ اس کے بھیجے ہوئے کلام میں تحریف کرتے ہیں اور پوری امت کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ نہایت بے شرم اور بے حرم ہو جاتے ہیں اور ان کے قلوب سیاہ ہو جاتے ہیں اور ان کی عقل ماری جاتی ہے۔

تیسری قسم کے مجرم وہ ہوتے ہیں جو مصلحت کی وجہ سے اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے اور فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہو جاتے ہیں اور بظاہر اپنے آپ کو دین کے پابند اور نیک لوگ ظاہر کرتے ہیں۔ ایسے مجرمین کو منافقین کہا گیا ہے اور

ان کی سزا کافر اور مشرکین سے بھی نیارہ ہوگی۔

ایسے نافرمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ظالم اور مجرم قرار دیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب کی وعید آئی ہے۔ اس ضمن میں قرآن الحکیم میں لاتعداد آیات موجود ہیں، لیکن یہاں پر حجت قائم کرنے کے لیے صرف چند آیات پیش خدمت کی جارہی ہیں۔ تاکہ قارئین کو ان کا ادراک ہو جائے اور وہ اپنی بخشش اور مغفرت کے لیے اپنی کوششوں کو اور تیز کر دیں اور اللہ تعالیٰ کی کامل تابعداری اختیار کر لیں۔

سورۃ النحل (۱۶) کی آیت (۶۱) میں فرمایا گیا ہے کہ:

"اگر اللہ کی طرف سے مواخذہ ہو جاتا لوگوں پر ظلم کرنے پر، تو وہ نہ چھوڑتا ایک بھی مخلوق کو زندہ (زمین پر)۔ لیکن اس نے مؤخر کیا اس بات کو ایک مقررہ وقت تک کے لیے اور جب ان کی باری آئے گی تو نہ اس میں دیر ہو سکے گی اور نہ ہی وہ کچھ مہلت پا سکیں گے"۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت اس کی صفت قہاری اور جباری پر حاوی نہ ہوتی تو ابھی تک وہ ان ظالموں کو برباد کر چکا ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ایک خاص مدت تک مہلت دیے ہوئے ہے کہ وہ اپنے ظلم سے باز آجائیں اور اپنے رب کی تابعداری اختیار کر لیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے لیے مہلت ان کی موت سے پہلے پہلے تک ہے اور موت کا وقت نہ معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی سے ایک یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ان بدبختوں کی پشت سے کتنے نیک لوگوں کا جنم لینا لکھ دیا گیا ہو۔ لہٰذا ان کو ختم کرنے سے وہ نیک لوگ بھی دنیا میں نہیں آسکیں گے۔ جیسا کہ قریش مکہ کے وہ لوگ جنہوں نے عالی جناب رسول کریمؐ کو قتل کرنے کی ٹھان لی تھی، اور وہ خود قتل ہونے سے بچ گئے تھے ان کی اولاد میں کتنے متقدر اصحاب رسول اللہ پیدا ہوئے۔

سورۃ توبہ (۹) کی آیات (۲۲) تا (۲۸) میں خاص طور پر منافقین کے بارے میں اور عمومی طور پر مشرکین کے بارے میں فرمان ربی ہے کہ:

"کوئی عذر مت بناؤ، تم نے کفر کیا ایمان لانے کے بعد۔ اگر ہم تم میں سے کچھ کو معاف کر دیں، تو ہم سزا دیں گے تم میں سے دوسروں کو، کیونکہ وہ ظالم تھے"۔ (۲۲)

"منافقین عورتیں اور مرد، آپس میں ایک جیسے ہیں۔ وہ لوگوں کو منکرات پر اکساتے ہیں اور منع کرتے ہیں معروف سے۔ اور وہ اپنے ہاتھوں کو باندھ لیتے ہیں (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے) وہ بھول گئے ہیں اللہ کو۔ پس اللہ ان کو بھول گیا ہے۔ بے شک! منافق لوگ فاسق ہیں"۔ (۶۷)

"اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے منافقین مردوں اور عورتوں سے اور کفار سے جہنم کی آگ کا، اس میں ہی یہ رہیں گے اور وہ ان کو بھون دے گی، اللہ نے ان پر لعنت بھیجی ہے اور ان پر عذاب ہوگا نہ ختم ہونے والا"۔ (۶۸)

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو مجرم قرار دیا ہے ان کی تفصیلاً وضاحت کر دی گئی ہے۔ سورۃ بقرہ (۲) کی آیات (۶) تا (۱۰) تک:

"بے شک! جو لوگ ایمان نہیں لائے، ان کے لیے ایک جیسا ہے کہ چاہو تم (اے محمدؐ) ان کو تنبیہ کر دیا نہ کرو، یہ ایمان والے نہیں"۔ (۶)

"(ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر مہر لگا دی ہے (ہدایت پانے کے لیے) اور ان کی آنکھوں پر بھی پردہ ڈال دیا ہے اور ان پر ہوگا ایک بڑا عذاب"۔ (۷)

"اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں (منافقین) جو کہتے ہیں کہ: ہم ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔ جبکہ حقیقت میں وہ ایمان نہیں لائے"۔ (۸)

"(وہ سمجھتے ہیں) کہ وہ دھوکا دے رہے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو۔ جبکہ وہ دھوکا دے رہے ہیں اپنے آپ کو۔ لیکن سمجھتے نہیں"۔ (۹)

"ان کے قلوب میں بیماری ہے (شک اور منافقت کی) اور اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری اور بڑھا دی ہے۔ پس ان کے لیے دردناک عذاب ہے، کیونکہ وہ جھوٹ بولتے تھے"۔ (۱۰)

کافروں کی بدبختی کہ وہ اپنی جہالت اور بتوں سے محبت کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول کا پیغام سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرتے تھے اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہتے تھے۔ اور اپنی جہالت کی وجہ سے اپنے ہاتھوں سے ہی بنائے اور تراشے ہوئے لکڑی اور پتھر کے اصنام

پوجتے تھے اور آج بھی پوجتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بے بس اور بے جان چیزیں جن پر اگر کوئی مکھی بیٹھ کر گندگی کر جائے تو ان کو ان کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ اگر فرض کرو ہوتی بھی ہے تو یہ ان کو اپنے اوپر سے ہٹا بھی نہیں سکتے۔ لیکن ان کی جہالت کا کیا کہیے کہ ان بے بس اور بے جان چیزوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی حاجت روائیاں کرتے ہیں۔ جب ان کی توجہ ان کی جہالت پر مبذول کرائی جاتی ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ ان کی معرفت خدا کی پوجا کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی جہالت اور ڈھٹائی کی وجہ سے ان کے متعلق کہہ دیا کہ یہ لوگ تو بے حس، جاہل، اندھے، اور گونگے ہیں۔ (اس لیے) ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے اور اس قابل نہیں کہ وہ اپنے لیے کسی اچھائی کے متعلق کچھ سوچ سکیں۔ اس لیے ان کی سزا روزِ قیامت یہ ہوگی کہ انہیں منہ کے بل گھسیٹ کر لایا جائے گا اور جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

۱۵۔ تجدید ایمان

ہمیں جب علم ہو گیا کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے اور ہمیں اس پر کامل یقین بھی ہو گیا اور مزید یہ بھی پتا چل گیا کہ کس طرح سے ایمان کے اصولوں پر قائم رہ کر ان کی پابندی کر لی ہوگی۔ اور پھر اس کے نتیجے میں ہمیں اللہ تعالیٰ کن کن انعامات سے نوازیں گے۔ بصورت دیگر اس کی نافرمانی کے باعث کتنے دہشت ناک عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

جب ہم اپنی زندگی کو ایمان کے راستے پر گامزن کر لیتے ہیں تو پھر ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے ایمان کی مسلسل تجدید کرتے رہیں۔ اس سے قبل کہ ہم اپنے مضمون کی طرف جائیں یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ مختصر ترین الفاظ میں ایمان کو پھر سے بیان کر لیا جائے تاکہ ہمارے ذہن میں سما جائے اور یاد دہانی ہو جائے کہ کن کن باتوں پر ایمان لانا لازم ہے تاکہ ہم تجدیدِ ایمان آسانی سے کرتے رہیں۔

ایمان کو اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایسے عقیدے پر جس پر ہمیں اللہ تعالیٰ کے رسول لے کر آئے ہیں اس کا اپنی زبان سے اقرار کریں اور اس پر اپنے دل کی گہرائیوں سے یقین کریں اور اس پر اپنے عمل کو پختہ کر لیں، تاکہ زندگی بھر اس پر یقین اور عمل کی کسی بھی صورت نفی نہ ہو۔ مثال کے طور پر جب ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ، پیغمبر، قرآن اور قیامت وغیرہ پر ایمان رکھتے ہیں تو اس اقرار کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ ہم اپنے اوپر اس ضمن میں کچھ ذمہ داریاں لازم کر لیتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ ہم اللہ کی حاکمیت اور دیگر صفات پر ایمان لاتے ہیں تو ہم کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے ہوتے۔ کیونکہ مسلمانوں کے علاوہ بہت سارے دیگر مذاہب کے لوگ بھی اللہ کو مانتے ہیں، اس پر یقین رکھتے ہیں اور اس پر بھروسہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں میں اور ایمان سے مزین لوگوں میں اللہ تعالیٰ کو ماننے کے باوجود واضح فرق ہوتا ہے، اور وہ فرق یہ ہوتا ہے کہ جب ایک

مسلمان کہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا تو وہ اس اقرار کے ساتھ اپنے آپ کو چند مخصوص قوانین کا پابند بنا لیتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایک کافر یا مشرک نہ تو ایمان کا مطلب سمجھتا ہے اور نہ ہی کوئی ذمہ داری ایمان کے ضمن میں قبول کرتا ہے۔ وہ صرف اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کو مانتا ہے۔ بس۔ جناب رسول کریمؐ کے دور میں مشرکین مکہ بھی تو اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے۔ لیکن ایمان کی روح سے واقف نہ تھے۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایمان کے دعوے دار کے لیے چند بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ:

(i) وہ کس بات پر ایمان رکھتا ہے؟

(ii) وہ کیا ایمان رکھتا ہے؟

(iii) کیا وہ اس بات کا اظہار اپنے قول و فعل سے بھی کرتا ہے یا نہیں؟

کیونکہ صرف زبانی اقرار کرنے والے ایمان کو اللہ تعالیٰ نے رد فرما دیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الحجرات (۴۹) کی آیت (۱۴) میں فرمایا رب تعالیٰ نے کہ:

"یہ بدو (گنوار) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (ان سے) کہو! تم ایمان نہیں لائے۔ بلکہ تم تو صرف یہ کہتے ہو کہ ہم طائع ہو گئے (اسلام کے) ایمان تو ہنوز تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔ لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم مانو گے تو اعمال کے انعامات میں سے کچھ کم نہ ہوگا۔ بے شک! اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے"۔

آج چودہ سو برس کے بعد اس دور میں بھی بے شمار بدو ہیں جو صرف دعویٰ کرتے ہیں مسلمان ہونے کا، لیکن مقام افسوس ہے کہ وہ ایمان کے تقاضوں کو جانتے تک نہیں۔ اور جب ان کا یہ حال ہوگا تو پھر ان کے اعمال کا کیا کہیے گا سوائے افسوس صد افسوس کے۔

ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ قواعد مقرر فرما دیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات (۴۹) کی آیت (۱۵) تا (۱۷) میں فرمایا ہے کہ:

"صرف وہی لوگ ایمان والے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول پر یقین کے ساتھ ایمان قبول کیا اور پھر اس کے بعد کسی قسم کا شک نہیں کیا۔ اور اللہ کی خاطر اپنی دولت سے اور اپنے نفوس سے جہاد کیا، اور وہی سچے ہیں (مومن)"۔ (۱۵)

"کہو (اے نبیؐ)! کیا تم اپنے دین کے بارے میں اللہ کو مطلع کرو گے؟ جبکہ اللہ جانتا ہے، جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔ (۱۶)

"وہ لوگ (بدو) تم پر احسان جتا رہے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کیا۔ (ان سے) کہو! اپنا اسلام مجھ پر مت جتاؤ۔ نہیں! بلکہ یہ تو تمہارے اوپر اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت بخشی۔ اگر تم سچے ہو تو (تمہیں سمجھ لینا چاہیے)"۔ (۱۷)

لیکن یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ ایمان پر مسلسل پختگی کے ساتھ قائم رہنا نہایت مشکل کام ہے۔ کیونکہ ابلیس ہمہ وقت ایمان والوں کے ایمان کے درپے رہتا ہے اور ہمیشہ شر انگیز وسوسے ان کے قلوب میں داخل کرتا رہتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے ایمان کی ذمہ داریاں پورا کرنے سے غفلت میں آ جائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ مسلسل اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس تجدید کے لیے کوئی حتمی وقت مقرر نہیں کیا، بس یہ فرما دیا ہے کہ "اے ایمان والو! ایمان لے آؤ" لیکن ذرا غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک چھوٹا سا جملہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کے حکم کا ایک تسلسل رکھتا ہے۔ جس میں وقت کی قید نہیں رکھی گئی لیکن تسلسل قائم ہے۔

اب اس حکم کی تفصیل کے لیے سورۃ النساء (۴) کی آیت (۱۳۶) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جس میں تجدید ایمان کا حکم آیا ہے:

"اے ایمان والو! ایمان لے آؤ، اللہ پر، اس کے رسول (محمدؐ) پر، اس کی کتاب (قرآن) پر، جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی۔ اور ان کتابوں پر جو پہلے نازل ہوئیں۔ اور پھر جس نے انکار کیا (کفر کیا)، اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا، اور آخرت کے دن کا، پس وہ یقیناً گمراہی میں دور تک نکل گیا"۔

اس آیت کریمہ کے جن پہلوؤں پر یاد دہانی کرائی گئی ہے وہ ہیں:

(۱) اللہ پر ایمان (۲) اس کے رسول محمدؐ پر ایمان (۳) اس کی کتاب قرآن پر ایمان (۴) وہ تمام الہامی کتب جو قبل از قرآن نازل ہوئیں پر ایمان (۵) فرشتوں پر ایمان اور (۶) روز قیامت پر ایمان۔

پس یہ چھ باتیں ہیں جن پر ایمان کی تجدید کرنے کا حکم دیا گیا ہے اللہ کی طرف سے۔ یہ آیت ایمان والوں کے لیے یقینی طور پر اہم اور غور طلب ہے کیونکہ اس میں ایمان کی تجدید کے لیے تسلسل کے ساتھ حکم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ حکم ہر ایمان والے پر ہر آنے والے لمحے کے لیے لازم ہو گیا۔ جب تک کہ وہ اس دنیا میں رہتا ہے وہ اس حکم کے تابع رہتا ہے۔ ابتدائی طور پر یہ معاملہ سمجھنے کے لیے کچھ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر ایمان والا کس طرح سے ہر آنے والے وقت پر ایمان لاتا ہے۔ یہ صرف اسی صورت ممکن ہو سکتا ہے کہ ہر ایمان والا ہر لمحے ایمان کی حالت میں زندگی بسر کرے۔ اور اس دوران وقفے وقفے سے اپنے ایمان کا اعلان اور اپنے عمل سے اس کا اظہار بھی کرتا رہے۔

اب اس کے متعلق دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایسا کرنا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے اور دوسرا سوال یہ کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ اس عمل کا مقصد تو آسانی سے سمجھ آ جاتا ہے کہ چونکہ اہلِ ایمان ہر لمحہ ابلیس کے وار کاری کی زد میں رہتا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اسی رفتار سے اپنے ایمان کی تجدید کرتا رہے۔

اب دوسرے سوال کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی حل کر رکھا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تجدید ایمان کے لیے چوبیس گھنٹوں میں کچھ خاص اوقات مقرر فرمائے ہیں تاکہ ایمان والوں کو اس کے لیے علیحدہ سے کوئی اہتمام نہ کرنا پڑے اور وہ اوقات ایسے ہیں جن میں اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کے حضور ہر روز پانچ بار پیش ہوتے ہیں۔ جبکہ وہ قیام، رکوع اور سجود کی حالت میں رہتے ہوئے اپنے مالک کی حمد و ثناء بیان کرتے ہیں اور اس صورت میں وہ اپنے عمل سے اور اپنی زبان سے اپنے مالک کے حضور پیش ہو کر اقرار کرتے ہیں اور اس حاضری کے واسطے اللہ تعالیٰ کا منادی دینے والا، دنیا کے ہر کونے میں مقرر کیا جا چکا ہے، جو اس مقصد کے لیے ایمان والوں کو بلاتا ہے اور یہ سلسلہ پوری دنیا میں قیامت تک کے لیے رہے گا۔ لیکن کتنے بدبخت ہیں وہ انسان جو اس بلاوے کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور نہ تو اپنے مالک کی حضوری میں حاضر ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے ایمان کی تجدید کرتے ہیں۔

بیان کی گئی سورۃ النساء (۴) کی آیت (۱۳۶) کے متعلق ایک ضروری نقطہ قابلِ تشریح

ہے۔ وہ یہ کہ بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیتِ شریفہ صرف اہلِ کتاب کے ایمان والوں کے لیے تاکیداً آئی ہے اور امتِ محمدیؐ کے ایمان والوں کے لیے نہیں ہے۔

مصنف اس بات سے قطعی متفق نہیں۔ کیونکہ اس آیت کریمہ میں جناب رسالت مآب اور قرآن پر ایمان لانے کے علاوہ ساتھ کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لانے کا بھی کہا گیا ہے۔ گویا یہ حکم تمام ایمان والوں کے لیے ہے۔ جہاں تک اہلِ کتاب کے ایمان والوں کے لیے حکم تجدید ایمان کا تعلق ہے وہ سورۃ الحدید (۵۷) کی آیت (۲۸) میں کیا ہے فرمایا گیا:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور ایمان لاؤ اس کے رسول پر۔ وہ تمہیں دے گا دوگنا اپنی رحمت میں سے اور عطا کرے گا ایک روشنی جس کے ذریعے تم چلو گے (سیدھا) اور وہ معاف فرمائے گا تمہیں، اور اللہ غفور اور رحیم ہے''۔

اس آیتِ شریفہ میں اہلِ کتاب ایمان والوں کو دوگنا اجر کی بشارت سنا دی گئی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ نبی پر بھی ایمان لائے اور پھر اب نبی آخر الزماں پر بھی ایمان لے آئے۔ ایسے لوگوں کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفلؓ جو عیسائی عالم تھے، انہوں نے جناب نبی کریمؐ کے اعلانِ نبوت سے پہلے ہی آپؐ کو نبی مان لیا تھا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ جب نبی کریمؐ پر پہلی وحی کا نزول ہوا، جبکہ آپؐ غارِ حرا میں تھے، جہاں جبرائیلؑ نے آپؐ کو پڑھنے کے لیے کہا۔ جس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ وہ پڑھ نہیں سکتے۔ یہ سوال و جواب تین مرتبہ ہوئے اور آپؐ کے کہنے پر کہ وہ پڑھ نہیں سکتے۔ جناب جبرائیلؑ نے آپؐ کے سینہ کے ساتھ اپنا سینہ لگا کر دبوچا۔ جس کے بعد پہلی وحی کا نزول ہوا۔ جس کے الفاظ تھے ''اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ'' (یعنی پڑھو! اپنے رب کے نام سے جو عظیم ہے)۔

اس واقعہ سے آپؐ گھبرا گئے اور اسی گھبراہٹ کے عالم میں گھر تشریف لے آئے۔ اور فرمایا ''مجھے کچھ اوڑھاؤ'' جناب خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دی اور پھر اپنے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ جنہوں نے آپؐ کو لا سریا اور کہا کہ آپؐ تو نبی بننے والے ہیں اور آپ

کے پاس وہی ناموس آیا ہے جو پچھلے پیغمبروں کے پاس وحی لے کر آتا تھا۔ اور پھر یہ بھی کہا کہ اگر وہ زندہ رہے تو ضرور آپ کی حمایت کریں گے، کیونکہ آپ کی قوم آپ کی دشمن بن جائے گی۔

دوسرا واقعہ جناب نجاشیؓ کا ہے جو ملک حبشہ کے بادشاہ تھے اور پکے عیسائی تھے۔ جب مکہ والے مسلمانوں کے جانی دشمن ہو گئے تھے تو چند خاندان مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ پہنچ گئے تھے، جہاں وہ جناب نجاشیؓ کی پناہ میں رہے۔ اسی دوران جب نجاشیؓ نے جناب جعفر بن ابوطالب سے قرآن سنا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، آپ اللہ کے رسول پر اور قرآن پر ایمان لے آئے۔ اسی لیے جب وہ فوت ہوئے تو نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تمہارا بھائی نجاشیؓ فوت ہو گیا ہے آؤ اس کے لیے صلوٰۃ (جنازہ) پڑھیں۔ یہ پہلی اور آخری نماز جنازہ غائبانہ تھی، جو رسالتمآب نے ادا کی۔ علاوہ ازیں جناب نجاشیؓ نے جناب رسول کریمؐ کی فرمائش پر جناب اُم المومنین اُم حبیبہؓ سے آپ کا عقد غائبانہ منعقد کیا، اپنی جیب سے مہر ادا کیا اور نکاح کے بعد حاضرین کو کھانا کھلایا اور پھر بڑے احترام کے ساتھ انہیں مدینہ کے لیے روانہ کر دیا۔

۱۶۔ بندے کا مالک سے عہدِ بندگی

جو شخص ہر روز پانچ مرتبہ اپنے ایمان کی تجدید کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کو حاکم کُل اور مالک کُل جانتا ہے اور خود کو اس کا ابدی غلام سمجھتا ہے۔ اور اپنے قول اور فعل کے ذریعہ اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کی بندگی کے فرائض میں شامل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا حکم اسے سورۃ الانعام (۶) کی آیت (۱۶۲۔۱۶۳) میں دیا ہے۔ فرمایا کہ:

"کہو! بے شک میری صلوٰۃ (نماز)، میری قربانی، میری زندگی اور موت (صرف) اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، جو مالک ہے تمام جہانوں کا، اور اپنی مخلوق کا پالنے والا رب (مالک) ہے"۔ (۱۶۲)

"جس کا کوئی (بھی) شریک نہیں، اور اس بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں ہی ہوں اول مسلمانوں میں سے"۔ (۱۶۳)

اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا جواب ہر ایمان والا اپنی ہر صلوٰۃ میں دیتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو عربی نہیں جانتے انہیں اس بات کا ادراک ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کچھ عرض کرتے ہیں اپنی صلوٰۃ میں۔ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم درج بالا کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں، اپنی ہر صلوٰۃ میں۔

ہر ایمان والا اپنی ہر نماز کے دوران جب وہ تشہد میں بیٹھتا ہے تو اس وقت وہ تشہد یا التحیات پڑھتا ہے۔ جس میں وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ:

"اس کی ہر قسم کی عبادات، خواہ وہ زبانی ہو، خواہ جسمانی، خواہ مالی، اور اس کی قربانی، یہ تمام کی تمام عبادات صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر اور اس کے حکم کے مطابق کی جاتی ہیں۔

افسوس صد افسوس کہ بیشتر لوگ جو ایمان والے بھی ہوتے ہیں ان الفاظ کو سمجھ ہی نہیں رہے ہوتے کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں، اور ان سے کیا تقاضا کیا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس کے حضور ان کے اس اقرار کی کیا حیثیت ہوگی جسے وہ جانتا تک نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس لیے ہر ایمان والے اور ہر مسلمان کو یہ سمجھنا لازم ہے کہ وہ اس بات کو ضرور جانے کہ ایمان کیا ہے، اور بندگی کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا تابعدار بندہ بننے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

فکر الحمد للہ رب العالمین۔

[illegible]

[illegible]

ہر حال میں پڑھنے کی دعا

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ اِيْمَانًا كَامِلًا وَّيَقِيْنًا

اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں کامل ایمان اور سچا یقین

صَادِقًا وَّرِزْقًا وَّاسِعًا وَّ قَلْبًا خَاشِعًا وَّلِسَانًا

اور کشادہ رزق اور عاجزی کرنے والا دل اور تیرا ذکر کرنے والی زبان

ذَاكِرًا وَّرِزْقًا حَلَالًا طَيِّبًا وَّ تَوْبَةً نَّصُوْحًا وَّ

اور حلال اور پاک روزی اور سچے دل کی توبہ اور موت سے پہلے کی توبہ

تَوْبَةً قَبْلَ الْمَوْتِ وَ رَاحَةً عِنْدَ الْمَوْتِ

اور موت کے وقت کا آرام اور مرنے کے بعد مغفرت

وَمَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَفْوَ عِنْدَ

اور رحمت اور حساب کے وقت معافی اور جنت کا حصول اور

الْحِسَابِ وَالْفَوْزَ بِالْجَنَّةِ وَالنَّجَاةَ مِنَ النَّارِ

دوزخ سے نجات (میں یہ سب کچھ مانگتا ہوں) تیری رحمت کے وسیلے سے اے

بِرَحْمَتِكَ يَا عَزِيْزُ يَا غَفَّارُ، رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

بڑی عزت والے، اے بڑی مغفرت والے اے پروردگار میرے علم میں اضافہ

وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِيْنَ. آمِيْن يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ

اور مجھے نیک لوگوں میں شامل فرمادے۔ آمین اے رب العالمین

عہدِ بندگی

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ شَیْئًا وَّ اَنَا اَعْلَمُ بِہٖ وَ اَسْتَغْفِرُکَ لِمَا لَآ اَعْلَمُ بِہٖ تُبْتُ عَنْہُ وَ تَبَرَّاْتُ مِنَ الْکُفْرِ وَالشِّرْکِ وَالْکِذْبِ وَالْغِیْبَۃِ وَالْبِدْعَۃِ وَالنَّمِیْمَۃِ وَالْفَوَاحِشِ وَالْبُھْتَانِ وَالْمَعَاصِیْ کُلِّھَا. اَسْلَمْتُ وَ اَقُوْلُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ کسی چیز کو تیرا شریک بناؤں اور میں اسے جانتا ہوں اور میں معافی مانگتا ہوں اس گناہ سے جس کا مجھے علم نہیں۔ میں نے اس سے توبہ کی اور بیزار ہوا کفر سے اور شرک سے اور جھوٹ سے اور غیبت سے اور بدعت سے اور چغلی سے اور بے حیائی کے کاموں سے اور تہمت لگانے سے اور باقی ہر قسم کی نافرمانیوں سے اور میں ایمان لایا اور کہتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (مالیجناب) محمد اللہ کے رسول ہیں۔

اقرارِ ایمان

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

میں ایمان لایا اللہ پر اور اُس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور اچھی بری تقدیر پر، کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جی اُٹھنے پر بعد مرنے کے۔